امت کی رہبری
مصنف
آیۃ اللہ جعفرسبحانی

امت کی رہبری

آیۃ اللہ جعفر سبحانی

عرض ناشر

عالم اسلام کی موجودہ صورت حال، مسلمان حکومتوں اور ملکوں کا باھم متحد نہ ھونا اسلامی اخوت و مساوات کا فقدان، اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بجائے غیر اسلامی تعلیمات کی طرف رجحان اور الٰھی طاقت وقوت پر اعتماد کے بجائے ان کا غیر الٰھی اور کھوکھلی طاقتوں پر ایمان۔ نتیجہ میں استعماری طاقتوں اور عالمی صھیونزم کا ان پر تسلط مسلمانوں کا بے مھابا قتل عام اور ان کے طبیعی وزمینی ذخائر کی اندھا دھند لوٹ کھسوٹ اور ساتھ ھی کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں کی بے بسی وبیکسی ایک صائب اور صحیح فکر رکھنے والے مسلمان کو بھت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ھے۔

ھم چودہ سوسال سے آج تک متفرق کیوں ھیں۔ مسلمانوں کے درمیان صدیوں سے اس فرقہ واریت کے اسباب کیا ھیں، مسلمانون میں کلام الٰھی کی یہ عملی تصویر کیوں نظر نھیں آتی جس میں وہ ارشاد فرماتا ھے اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا؟ بلکہ مسلمان خود ایک دوسرے کے جانی دشمن کیوں بنے ھوئے ھیں کیا ھم عملاً کھہ سکتے ھیں کہ اسلامی تعلیمات عالم انسانیت کی فلاح کے لئے بھترین تعلیمات ھیں۔ قرآن کے آئیڈیل مسلمان جو اشداء علی الکفار رحماء بینھم؟ کی عملی تصویر ھیں پوری اسلامی تاریخ میں انگلیوں پر گننے کے قابل کیوں ھیں۔

اس کا صاف جواب یہ ھے کہ ھمارے پاس آنحضرت کی رحلت کے بعد سے کوئی عملی قرآنی لیڈر شپ نھیں رھی مسلمانوں نے ابتدا ھی سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد نہ قرآنی

تعلیمات پر سنجیدگی سے عمل کیا اور نہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر کان دھرے اور خدا پسند مسلمان بننے کے بجائے خود پسند مسلمان بنے۔ قرآن کریم کے معلم اول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد قرآن کے جن معلموں کو "حدیث ثقلین" کی روشنی میں همارے درمیان چھوڑ گئے تھے مسلمانوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تاریخ میں محفوظ هے اور کسی باهوش مسلمانوں سے پوشیدہ نهیں هے۔

لهذا ان حالات کی روشنی میں آج بھی یہ بحث تازہ اور گرما گرم هے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو خدا کی جانب سے بھیجے گئے تھے اور الٰهی تعلیمات اور قرآنی دستور العمل هماری حیات کے لئے لئے آئے تھے۔ ان کی رحلت کے بعد کیا مسلمان تمام الٰهی تعلیمات اور قرآنی دستور حیات سے اتنے آگاہ هو چکے تھے کہ انهیں پھر کسی الٰهی معلم قرآن کی ضرورت نهیں رہ گئی تھی اور وہ اپنی مرضی سے الٰهی نظام حیات کو چلا سکتے تھے؟ دوسرے لفظوں میں کیا وہ خدا سے زیادہ اپنے حالات و معاملات سے آگاہ هو گئے تھے؟

یا "عدول" کا لقب پانے والے آنحضرت کے اصحاب نے خدا، قرآن اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستورات کے خلاف خدا و رسول کی مرضی کے بجائے اپنی مرضی کو عملی جامہ پهنایا اور "امت کی رهبری" اپنے هاتھوں میں لے لی۔ انجام کار سامنے هے کہ مسلمان آج چودہ سو برسوں سے ترقی کے بجائے زوال کی طرف مائل هیں اور خدا کی جانب سے "مغضوب" اور "ضالین" شمار کی جانے والی قومیں ان پر غالب هیں۔

یہ کتاب "امت کی رهبری" جو آپ کے هاتھوں میں هیں اسی موضوع پر آیۃ اللہ شیخ جعفر

سبحانی مدظلہ کی ایک بھترین کاوش ھے جسے موجودہ افکار وخیالات کی روشنی میں نئے رخ سے پیش کیا گیا ھے امید ھے کہ خداوند عالم اس کے ذریعہ حق کے جویا افراد کی ھدایت فرمائے۔

آمین یارب العالمین

مقدمہ

اس کتاب کی تحریر کا مقصد

پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد امت کی قیادت ورھبری کا مسئلہ اسلام کے ان اھم مسائل میں سے ھے جس کی تحقیق ھر طرح کے تعصب وغرض ومرض سے دور پر سکون ماحول میں کی جانی چاھئے۔

سب سے پھلا مسئلہ جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد زبانوں پر آیا اور بحث کا موضوع بنا اور آج بھی اس پر بحث وتحقیق جاری ھے وہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی سیاسی وسماجی قیادت ورھبری کا مسئلہ تھا کیونکہ اس میں کوئی شک نھیں ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ھر جھت سے مسلمانوں کے سر پرست ورھبر تھے۔قرآن کی متعدد آیتیں آنحضرت کی وسیع قیادت ورھبری کی گواھی دیتی ھیں جن میں سے بعض آیتیں ھم یھاں ذکر کرتے ھیں:

1۔ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (1)

اللہ،رسول اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرو

2۔ "النبی اولیٰ بالموٴمنین من انفسھم" (2)

پیغمبر مومنوں (کی جان ومال) پر ان سے زیادہ سزاوار ھے۔

اس وسیع وعریض قیادت ورھبری کا ایک پھلو اسلامی سماج میں عدالت قائم کرنا ھے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں اپنے قیام کے دوران خود یا مدینہ سے باھر دوسروں کے ذریعہ سماج میں عدالت برقرار کرتے تھے۔قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ھے کہ اپنے معاملات

اوراختلافات میں

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں کو بے چون وچرا تسلیم کریں:

"فلا وربك لا یوٴمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما" (3)

)تمھارے پروردگار کی قسم وہ لوگ ھرگز مومن واقعی شمارنھیں ھوں گے جب تک وہ اپنے اختلاف میں تمھیں حَکَم اور قاضی قرارنہ دیں اوراس پر ذرابھی ملول نہ ھوں اورتمھارے فیصلہ پرمکمل تسلیم ھوں)

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی سماجی رھبری کاایک پھلو اسلام کے مالی واقتصادی امور کاادارہ کرناھے کہ آنحضرت اپنی حیات میں ان کاموں کوانجام دیتے تھے۔قرآن مجید نے ان الفاظ میں آپ کوخطاب کیاھے:

"خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزکیهم بها")4)

ان کےاموال میں سےزکوات لواوراس طرح انھیں پاک کرو۔

دوسری آیات میں زکات اورٹیکس کی مقداراوران کےمصارف کابھی پوری باریکی کےساتھ ذکرکیاگیاھے۔

ان آیات کے معانی،ان کی وضاحت کرنے والی روایات اورخودآنحضرت کاطرزعمل یہ بتاتاھے کہ آنحضرت مسلمانوں کےسرپرست،سماج کےحاکم ،اورملت وامت کےفرمانروا تھے۔اورجوسماج کامطلق العنان حاکم انجام دیتاھے وہ انجام دیتے تھے۔فرق یہ تھا کہ یہ سرپرستی اورحکومت لطف الٰھی کی شکل میں خدا کی طرف سے آپ کوعطاھوئی تھی۔لوگوں نے

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس منصب کے لئے منتخب نھیں کیا تھا۔نقطۂ حساس یہ ھے کہ ھم یہ جانیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی رحلت کے بعد امت کی باگڈور اور سرپرستی کس کے ذمہ ھے اور اسلامی سماج کی اجتماعی وسیاسی قیادت کس کے ھاتھ میں ھونی چاھئے جو سماج کو ھرج ومرج،فساد اور پسماندگی سے محفوظ رکھے؟

اس میں کوئی شک نھیں ھے کہ اسلام جیسے عالمی وجاودانی دستور میں اس امر کو فراموش نھیں کیا گیا ھے اور اس کے لئے ایک بنیادی منصوبہ پیش کیا ھے اور وہ ھے"اولی الامر" کی پیروی واطاعت جو ھم پر واجب کی گئی ھے اور اس سلسلہ میں کوئی بحث نھیں ھے۔پس یھاں جو نکتہ قابل بحث ھے یہ ھے کہ جن حکام کی اطاعت واجب کی گئی ھے مسلمان ان کی شخصیت کو پھچانیں تا کہ خوب اطاعت کریں۔

مسلمانوں کا ایک گروہ یہ کھتا ھے کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خداوند عالم کے حکم سے اسلامی سماج کے سیاسی واجتماعی امور کو ادارہ کرنے کے لئے اپنے بعد حاکم ے احکام معین کئے ھیں ۔اس گروہ کے مقابل ایک دوسرا گروہ ھے جو یہ کھتا ھے کہ خداوند عالم نے لوگوں کو یہ اختیار دیا ھے کہ

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد اپنے لئے حکام کا انتخاب کریں۔شیعہ پھلے نظریہ کے اور اھل سنت دوسرے نظریہ کے طرفدار ھیں۔

اگر مسلمانوں کی امامت وپیشوائی کا مسئلہ اسی حد میں ھو کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کی رحلت کے بعد اسلام کے اس سیاسی واجتماعی منصب پر کون فائز ھوا،اس شخص کی

تعیین کس شکل میں هوئی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس منصب پر کسی کو معین کیا یا کوئی شخص عوام کی جانب سے اس منصب کے لئے منتخب هوا، تو یہ بحث صرف ایک تاریخی پهلو کی حامل هوگی اور چودہ صدیوں کے بعد آج کی نسل کے لئے کوئی خاص سازگار اور مفید نهیں هوگی۔ (اگر چہ ان افراد کی شناخت بھی اس عهد کے لوگوں کے لئے ضروری اور اهم شمار هوتی تھی) لیکن اگر بحث کی شکل تبدیل هو اور یہ کها جائے کہ بحث کا موضوع پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد اسلامی سماج کی صرف سیاسی واجتماعی قیادت هی نهیں هے بلکہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس منصب کے علاوہ "دین کے اصول وفروع میں بھی مرجعیت ورهبری کا منصب رکھتے تھے۔ تو اب سوال یہ هے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد اس پهلو کی قیادت کس کے ذمہ هے؟ اور کیسے اشخاص کو حلال وحرام اور امر ونهی کا منصب دار هونا چاهئے تا کہ اسلامی حقائق کے سلسلہ میں ان کے اقوال اور نظریات صبح قیامت تک انسانوں کے لئے حجت هوں؟ اس صورت میں امام کی شناخت اور دینی امامت وپیشوائی کے سلسلہ میں بحث هر مسلمان کی زندگی کا حصہ قرار پاتی هے اور کوئی شخص بھی اس معرفت سے بے نیاز نهیں هوسکتا۔ اب اس مطلب کی وضاحت پر توجہ دیں:

اسلامی معارف واحکام میں قیادت ومرجعیت:

اس میں کوئی شک نھیں ھے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قیادت ورھبری صرف سیاسی و سماجی امور میں نھیں تھی بلکہ آپ قرآنی آیات کے مطابق اس الٰھی کتاب کے معلم 1 ،قرآن کے مشکل مطالب کی تبیین و وضاحت کرنے والے 2 ،اورالٰھی احکام وسنن کو بیان کرنے والے تھے3 ۔اس اعتبار

1۔"یعلمھم الکتاب والحکمۃ"(5)

2۔"وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما انزل الیھم")6)

3۔"وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا" (حشر/7)(7)

سے پورے اسلامی معاشرہ کا اس پر اتفاق ھے اورقرآنی نصوص بھی گواھی دیتی ھیں کہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور بندوں کے فرائض میں آنحضرت کا قول وعمل لوگوں کے لئے سند اور حجت ھے۔

اس کتاب کے چوتھے حصہ میں واضح طور سے بیان کیا گیا ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی رحلت کے ساتھ لوگوں کی تعلیم وتربیت کی ضرورت پوری نھیں ھوئی تھی اورابھی اسلام کی علمی وعملی تحریک اپنے کمال کونھیں پھنچی تھی کہ پھر سماج کومعصوم رھبروں کی ضرورت نہ رھے۔لھٰذا ضروری ھے کہ رسول خدا کی رحلت کے بعد کوئی شخص یا جماعت اسلام کے احکام اوراس کے علمی ،فکری وتربیتی اصول کی رھبری ومرجعیت کا عھدہ اس روز تک سنبھالے جب تک اسلام کا یہ انقلاب پوری طرح سے بارورھوجائے۔

اب دیکھنا یہ ھے کہ اس منصب ومقام کے لئے کون سے افراد شائستہ ھیں تاکہ اسلامی معاشرہ ھر عھد اور ھر زمانہ میں ان کے افکار وکردار وگفتار سے فائدہ اٹھائے۔اوران کی

ھدایات و رھنمائی میں حلال خدا کو حرام سے اور واجبات کو محرمات سے تشخیص دے سکے ۔نتیجہ میں اپنے دینی فرائض پر عمل کر سکے ۔اس گروہ کی شناخت اور ان کی تعلیمات و ھدایات سے آگاھی حاصل کرنا ھر مسلمان پر لازم وضروری ھے۔اس کتاب میں اسی بات کی کوشش کی گئی ھے کہ پیغمبر اکرم کے شائستہ اور سچے جانشینوں کا تعارف کرایا جاسکے۔

ظاھر ھے کہ (پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد امت کی رھبری) کی بحث کو پیش کرنے کا مطلب یہ ھرگز نھیں ھے کہ موجودہ حساس حالات میں مذھبی اختلافات کو بھڑکایا جائے یا تعصب آمیز اور بے ثمر وغیر مفید بحث کو جاری رکھا جائے۔ کیونکہ ان حساس اور نازک حالات میں نہ صرف حالات کو پھیلنے سے روکا جانا ضروری ھے بلکہ انھیں کم سے کم کرنے کی کوشش کرنا چاھئے اور درحقیقت انسان کی عمر اس سے کھیں زیادہ قیمتی ھے کہ تعصب آمیز بحث چھیڑی جائے اور اپنی اور دوسروں کی عمر تباہ کی جائے۔ بلکہ مقصد یہ ھے کہ ھر طرح کے تعصب وکینہ سے دور رہ کر ایک اھم اور اساسی مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے حقائق کی بنیاد پر اس کی محققانہ اور منطقی تحقیق کی جائے۔تا کہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے درمیان مزید قربت اور تفاھم پیدا ھواور وہ زھر افشانیاں ختم ھوجائیں جو ھمارے دانا دشمن اور نادان دوست اس سلسلہ میں کیا کرتے ھیں۔امت کی رھبری سے مربوط بحثوں میں دو بنیادی اصل ھمارے پیش نظر ھیں:

1۔پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانشینی جیسے اھم مسئلہ میں حقائق وواقعیات کو پھچانا جائے۔

2۔مسلمانوں کے درمیان مفاهمت اورقربت پیدا کرنے میں مدد کی جائے اوران عوامل و اسباب کو برطرف کیا جائے جوسوءظن کا باعث هوتے هیں اورجن سے دشمن فائدہ اٹھا کرهم میں اختلاف پیدا کرتا هے۔

اس کتاب کے مطالب چند برس پهلے تهران میں یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے (حسینیۂ بنی فاطمہ(ع)) میں درس کے طور پر بیان کے گئے تھے جو کافی حد تک لوگوں کومکتب اهل بیت(ع) سے آشنا کرنے اورآنحضرت کے شائستہ جانشینوں کی معرفت کا باعث هوئے تھے۔جنهیں شائقین کے اصرار پرکتابی شکل میں شائع کیا جارها هے یہ کتاب اس بحث کا پهلا حصہ هے جو24چوبیس فصلوں پر مشتمل هے۔انشاءاللہ دوسرا حصہ بھی جلدشائع هوگا۔

وماتوفیقی الا بأﷲعلیہ توکلت والیہ انیب

جعفرسبحانی

حوزۂعلمیہ قم المقدسہ

اسلامی جمهوریہ ایران

*****

پهلی فصل

امام کی شناخت کا فلسفه

مسلمانوں کا اتحاد و یکجھتی ایک ایسی واضح چیز ھے جس کی ضرورت سے کسی بھی عقلمند کو انکار نھیں ھے، کیونکہ جو لوگ ایک کتاب کی پیروی کرتے ھیں اور اساسی و اصولی مسائل پر اتفاق رائے رکھتے ھیں وہ مختلف فرقوں، گروھوں دشمن جماعتوں کی شکل میں کیوں رھیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ھوں؟ اگر ماضی میں لوگوں کے اکثر طبقوں کو اس اتحاد کی ضرورت کا احساس نھیں تھا تو آج جب کہ استعماری طاقتیں اسلامی ممالک کے قلب پر حملہ آور ھیں اور ھر روز آگے بڑھتی نظر آتی ھیں ایسے میں ھر عاقل وھوشیار شخص کو اتحاد کی ضرورت کا بھرپور احساس ھے۔

کون غیرت مند مسلمان ھوگا جو فلسطین، بوسنیہ، کشمیر، چچنیہ اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی ناقابل بیان حالت کو دیکھے اور خون کے آنسو نہ روئے اور اس بے حسی اور پراکندگی پر گریہ نہ کرے؟!/span

مسلمان، دنیا کی ایک چوتھائی جمعیت کو تشکیل دیتے ھیں۔اور انسانی طاقت، زمینی ذخائر اور اصیل اسلامی ثقافت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ غنی جمعیت ھیں۔ایسی مادی اور معنوی طاقتوں سے سرشار مسلمان سیاست کے میدان میں سب سے زیادہ باوزن ھوسکتے ھیں اور دنیا کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی قیادت ورھبری اپنے ھاتھ میں لے سکتے ھیں اور استعمار نیز اسلامی اتحاد کے مخالفوں کی بنائی ھوئی بھت سی جغرافیائی حدوں کو نادیدہ قرار دے کر مسلمانوں کی باھمی ضرورتیں پوری کرسکتے ھیں نیز اقتصادی وثقافتی مبادلات کے ذریعہ

اپنے حالات بھتر بنا سکتے ھیں ۔اس طرح اپنی سیادت وسرداری دوبارہ حاصل کر سکتے ھیں لیکن اتحاد کی اس اھمیت کو مدنظر رکھنے کے باوجود امام کی شناخت ومعرفت کے موضوع کو اسلامی اتحاد کی راہ کا کانٹا نھیں سمجھنا چاھئے اور اسے اس اتحاد کی راہ میں رکاوٹ نھیں سمجھنا چاھئے ،جس کی ضرورت کو سبھی محسوس کرتے ھیں ۔

اکثر دیکھا گیا ھے کہ بعض سادہ لوح یا فریب خوردہ جوان اسلامی اتحاد کوحضرت عثمان کا کرتھ بنا کر طالبان حقیقت پر سخت تنقید کرتے ھوئے کھتے ھیں:

ابوبکر وعلی (ع) کی خلافت کی بحث اور یہ کہ صحیح جانشین کون ھے ایک غیر مفید اور بے ثمر بحث ھے ۔اس لئے کہ زمانہ کا پھیا اب پیچھے نھیں گھومے گا اور ھم پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حقیقی جانشین کو زندہ نھیں کر پائیں گے کہ اسے اس کا حق دلائیں اور مسند خلافت پر بٹھائیں اورمخالف کی تنبیہ اوراس کا مواخذہ کریں پس بھتر ھے کہ یہ فائل ھمیشہ کے لئے بند کر دی جائے اوراس کے بجائے کوئی دوسری گفتگو کی جائے!

اس خیال کے حامل افراد اس بحث کے درخشان نتائج سے غافل ھیں لھذا انھوں نے اسے غیر اھم ،بے فائدہ اور اسلامی اتحاد کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا ھے ،لیکن ھمارے خیال سے یہ فکر امام شناسی کے فلسفہ سے غفلت اور لاعلمی کے علاوہ اور کچہ نھیں ھے کیوں کہ اگر اس بحث کا مقصد جھوٹے دعویداروں کے درمیان صرف پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حقیقی جانشین کا پھچاننا ھوتو اس صورت میں ممکن ھے کہ اس طرح کی بحثوں کو غیر مفید و بے ثمر کھیں اور افراطیوں کی طرح جو ھر طرح کی علمی و منطقی بحث کو اسلامی اتحاد کے خلاف سمجھتے ھیں ھم بھی

اسے اتحاد کی راہ کا کانٹا سمجھیں۔اس لئے کہ اب کیا فائدہ ھے کہ چودہ صدیوں کے بعد حق کو ناحق سے تشخیص دینے کی کوشش کی جائے اور غاصب کے خلاف ایک غائبانہ حکم صادر کیا جائے جس کی کوئی عملی ضمانت نھیں ھے۔

لیکن یہ اعتراض اس وقت بیجا ھے جب ھم علمائے اھل سنت کی طرح اسلامی امامت و خلافت کو ایک طرح کا عرفی منصب جانیں جس کا فریضہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرنا، دفاعی طاقتوں کو مظبوط کرنا، عدل و انصاف کو رواج دنیا، حدود الٰھی کو قائم کرنا اور مظلوموں کو ان کا حق دلانا وغیرہ ھو، کیونکہ اس صورت میں اس قسم کی بحثوں کی نوعیت یہ ھوگی کہ ھم بیٹہ کر یہ بحث کریں کہ پندرھویں صدی عیسوی میں برطانیہ پر کس شخص کی حکومت تھی یا لوئی پنجم کے بعد تخت حکومت پر بیٹھنے کا حق کس کو تھا؟!

لیکن شیعی نقطہ نظر سے جو امامت کو رسالت کا سلسلہ اور نبوت کے فیض معنوی کا تتمہ سمجھتے ھیں، اس طرح کی بحث لازمی وضروری ھے کیونکہ اس صورت میں امام کے فرائض صرف مذکورہ بالا امور میں ھی خلاصہ نھیں ھوتے ھیں۔ بلکہ ان تمام امور کے علاوہ امام ،حضرت رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد احکام الٰھی کو بیان کرنے والا،قرآن کی مشکل آیات کا مفسر اور حرام وحلال کو بتانے والا بھی ھے۔اس صورت میں یہ سوال پیش آتا ھے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد مسلمانوں کو احکام الٰھی کی تعلیم دینے اور حرام وحلال بتانے والا کون ھے تاکہ پیش آنے والے نئے مسائل میں قرآن کی نص اور پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کوئی معتبر حدیث موجود نہ ھونے کی صورت میں

مسلمان اس کی طرف رجوع کریں اوراس کا قول ان موارد میں حجت قرار پائے۔(1)
اصولا اسلامی امت قرآن کے مشکلات اور اختلافی مسائل میں کہ جن کی تعداد محدود بھی نھیں ھے آخرکس صاحب منصب کی طرف رجوع کریں اورکس کے قول وعمل کو اپنی زندگی کے لئے حجت اور چراغ راہ قرار دیں؟(2)

یھی وہ منزل ھے جھاں ھم رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علمی جانشین کے بارے میں بحث کی ضرورت محسوس کرتے ھیں اور یھاں یہ مسئلہ مکمل طور سے زندہ صورت اختیار کرلیتا ھے کیونکہ اس نظریہ کی روشنی میں امام، الٰھی معارف اوراصول واحکام میں امت کا رھنما ھوتا ھے اور جب تک یہ منصب قطعی دلائل کے ذریعہ پھچانا نہ جائے صحیح نتیجہ تک نھیں پھنچا جاسکتا۔

اگرمسلمان تمام اصول وفروع میں اتفاق واتحاد رکھتے تو امامت کے سلسلہ میں بحث اس قدرضروری نہ ھوتی، لیکن افسوس کہ ان کے یھاں کم ھی مسائل میں اتحاد پایا جاتا ھے۔اب ھم جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے چودہ سوسال بعد وجود میں آئے ھیں، ھمارا وظیفہ کیا ھے؟ آیا اس زمانہ میں پیدا ھونے والے مسائل، مشکلاتِ قرآن اور اختلافی مسائل میں کسی نہ کسی صحابی کی رائے منجملہ (ابوحنیفہ یا شافعی) کی طرف رجوع کریں یا حضرت علی ں اوران کی گرانقدر اولاد کی طرف رجوع کریں جن کے لئے شیعوں کا دعویٰ ھے کہ ان کی فضیلت، عصمت، طھارت، وسیع وعمیق علم اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانب سے ان کے منصب امامت پر فائز کئے جانے کے سلسلہ میں عقلی ونقلی دلیلیں

موجودھیں؟

اس سوال کا جواب اسی "امام شناسی" کے موضوع اورولایت کی بحث میں ملے گا جس میں تحقیق ،انسان کو مذکورہ بالا مشکلات میں حیرت وسرگردانی سے نجات دے دیگی۔حتی اگرھم مسئلہ خلافت کوبھی چھوڑ دیں اور پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد مسلمانوں کی سر پرستی و حاکمیت جو حقیقت میں ایک معصوم کا حصہ ھے، سے چشم پوشی کرلیں توصرف اسی مسئلہ کی تحقیق کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد مسلمانوں کا دینی وعلمی مرجع وراھنما کون ھے، بھت سی جھات سے بڑی اھمیت رکھتا ھے اور مسلمانوں کی مکمل سعادت وخوشبختی بھی اس سے وابستہ ھے اس لئے ضروری ھے کہ جو باتیں ھم بعد میں وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے یھاں بھت اختصار کے ساتھ ذکر کردیں:

اگرھم اس وقت خلافت وحاکمیت کے مسئلہ سے صرف نظر کردیں تو پورے اطمینان کے ساتھ کھہ سکتے ھیں کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مکرر تصریحات وتاکیدات کی روشنی میں آپ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے پاس قرآن کے علاوہ صرف ایک دینی وعلمی مرجع و ملجا ھے اور وہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اھل بیت علیھم السلام ھیں، کیونکہ آنحضرت نے مختلف موقعوں پر کتاب وعترت کے اٹوٹ رشتہ کوصراحت کے ساتھ بیان کیاھے:

"یا ایھا الناس انی یوشك ان ادعی فاجیب و انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض و عترتی اھل بیتی و ان اللطیف اخبرنی انھما لن یفترقا"

"اے لوگو! میں عنقریب خدا کی دعوت پر لبیک کهنے والا هوں ۔میں تمهارے درمیان دو گرانقدر اور سنگین امانتیں چھوڑے جارها هوں ۔ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت هے ۔اللہ کی کتاب وحی الٰهی اور ریسمان نجات هے جو آسمان سے زمین تک پھیلی هوئی هے اور میری عترت اور اهل بیت (ع)۔خدائے لطیف نے مجھے خبر دی هے کہ یہ دونوں هر گز جدا نهیں هوں گے"

پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان دونوں حجتوں کی باهم ملازمت کو دینے آخری حج کے روز عرفہ یا غدیر کے دن منبر سے یا اپنی بیماری کے دوران بستر پر لیٹے هوئے جب کہ آپ کا حجرہ اصحاب سے بھرا هوا تھا صراحت سے بیان کیا اور آخر میں فرمایا هے کہ:

"هذا علی مع القرآن و القرآن مع علی لا یفترقان" (3)

یہ علی (ع) همیشہ قرآن کے ساتھ هیں اور قرآن علی (ع) کے همراہ هے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نهیں هوں گے۔

حدیث ثقلین کے مدارک اور حوالے ایک دو نهیں هیں جن کو یهاں ذکر کر دیا جائے ۔اس حدیث کے مدارک علامہ میر حامد حسین هندی نے اپنی گرانقدر کتاب "عبقات الانوار" کی بارهویں جلد میں بیان کئے هیں اور یہ کتاب هندوستان میں چھپ چکی هے اور چند سال پهلے چہ جلدوں میں اصفهان میں بھی دوبارہ چھپی هے، اور دار التقریب مصر سے بھی اس سلسلہ میں ایک کتاب چھپ چکی هے جس کی بنیاد پر جامعہ الازهر کے سربراہ شیخ شلتوت نے چار مذاهب کی پیروی کے انحصار کو توڑا اور فتوا دیا کہ فقہ امامیہ کی پیروی بھی صحیح اور مجزی هے۔ شیخ

شلتوت سے پوچھا گیا کہ بعض لوگوں کا اعتقاد ھے کہ ھر مسلمان پر لازم ھے کہ اپنی عبادات اور معاملات صحیح کرنے کے لئے چار مشھور مذاھب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کی تقلید کرے کہ شیعہ اثنا عشری اور زیدی مذھب ان میں سے نھیں ھیں، کیا جناب عالی بھی اس کلی نظریہ سے اتفاق رکھتے ھیں اور اثنا عشری مذھب کی تقلید و پیروی کو منع فرماتے ھیں؟ تو انھوں نے جواب میں کھا:

1۔ اسلام نے اپنے کسی پیروکار پر یہ واجب نھیں کیا ھے کہ (فرعی احکام میں) کسی معین مذھب کی پیروی کرے۔ ھم کھتے ھیں کہ ھر مسلمان کو یہ حق ھے کہ ھر اس مذھب کی پیروی کرے جو صحیح مدارک کے مطابق ھم تک نقل ھوا ھے اور اس کے احکام کو مخصوص کتابوں میں تدوین کیا گیا ھے۔ اسی طرح جن لوگوں نے کسی ایک مذھب کی پیروی کی ھے --- چاھے وہ جو بھی مذھب ھو --- وہ دوسرے مذھب کی طرف رجوع کر سکتے ھیں اور اس میں کوئی حرج نھیں ھے۔

2۔ جعفری مذھب، مشھور اثنا عشری امامیہ مذھب ھے اور ان مذھبوں میں سے ھے کہ اھل سنت کے تمام مذھبوں کی طرح اس کی بھی تقلید کی جا سکتی ھے۔

لھذا بھتر ھے کہ تمام مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ھوں اور کسی خاص مذھب سے تعصب کرنے سے پرھیز کریں کیونکہ اللہ کا دین اور اس کا قانون کسی خاص مذھب کے تابع اور کسی معین و مخصوص مذھب میں منحصر نھیں ھے۔ (اسلامی مذاھب کے پیشوا) سب مجتھدین اور خداوند عالم کے نزدیک مقبول ھیں اور جو لوگ اھل نظر اور صاحب اجتھاد نھیں ھیں ان کے

لئے جائز ہے کہ ان حضرات کی تقلید کریں اور جو کچھ انھوں نے فقہ میں مقرر کیا ہے اس پر عمل کریں۔اس سلسلہ میں عبادات ومعاملات میں کوئی فرق نہیں ہے۔(4)

دوسری فصل

امامت کے سلسلہ میں دو نظریئے

خلافت، علمائے اھل سنت کی نظر میں، ایک ایسا اجتماعی وسماجی عھدہ ومنصب ھے جس کے لئے اس سے مخصوص مقاصد کی لیاقت وشائستگی کے علاوہ کوئی اور شرط نھیں ھے۔ جب کہ شیعی نقطۂ نظر سے امامت ایک الٰھی منصب ھے جس کا تعین خدا کی طرف سے ضروری ھے اور وہ بھت سے حالات اور ذمہ داریوں میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے برابر و یکساں ھے۔

لھٰذا امامت کی حقیقت کے سلسلے میں علماء کے یھاں دو نظریئے پائے جاتے ھیں ایک نظریہ اھل سنت کے علماء کا ھے اور دوسرا شیعہ علماء کا نظریہ ھے:

الف۔ علمائے اھل سنت کا نظریہ:-

علمائے اھل سنت کی عقائد وکلام کی کتابیں اس بات کی حکایت کرتی ھیں کہ امامت ان کی نظر میں وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کے دینی ودنیوی امور کی سرپرستی ھے اور خود "امام" اور ان کی اصطلاح میں "خلیفھ" وہ شخص ھے جو پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد اس منصب کا ذمہ دار ھے اور مسلمانوں کے دینی و دنیاوی امور سے مربوط ھر گرہ اسی کے ذریعہ کھلتی ھے۔

یہ علماء، امامت کی یوں تعریف کرتے ھیں:

"الامامة رئاسة عامة فی امور الدین و الدنیا خلافة عن النبی (ص)" (5)

اھل سنت کے نظریہ کے مطابق یہ عظیم دینی واجتماعی عھدہ ومنصب ایک سماجی بخشش ھے جو

لوگوں کی طرف سے خلیفہ کو عطا ھوئی ھے اور خلیفہ انتخاب کے ذریعہ اس مرتبہ پر فائز ھوا ھے ۔خلیفہ کی ذمہ داریوں کا دائرہ بھی مذکورہ تعریف میں پورے طور سے مشخص کردیا گیا ھے۔

الف:۔دینی امور کی سرپرستی: اس سے مراد یہ ھے کہ لوگوں کے دینی مشکلات خلیفہ کے ھاتھوں حل ھوتے ھیں مثلا پوری دنیا میں جھاد کے ذریعہ اسلام کی توسیع ایک دینی امر ھے جس کا عھدہ دار امام کو ھونا چاھئے۔

ب:۔دنیاوی امور کی سرپرستی: امام وخلیفہ کو چاھئے کہ طاقت کے ذریعہ عمومی امن وامان قائم کرے اور لوگوں کے اموال ان کی ناموس اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرے۔

اس تعریف اور خلیفہ کے سپرد کی گئی ذمہ داریوں پر غور کرنے سے ایک حقیقت سامنے آتی ھے اور وہ یہ کہ امام یا خلیفہ ان کے نقطہ نظر سے ایک فرعی اور ایک سماجی حاکم ھے جو ملکی قوانین کا اجراء کرنے عمومی امن وامان قائم کرنے اور سماجی عدل وانصاف برقرار کرنے کے لئے منتخب ھوا ھے اور اس طرح کی حاکمیت کے لئے لیاقت وشائستگی کے علاوہ کسی اور چیز کی شرط نھیں ھے (نہ اسلامی احکام کے کلی ووسیع علم کی ضرورت ھے اور نہ سھو وخطا سے معصوم ھونے کی ضرورت ھے)

دوسرے لفظوں میں کوئی بھی معاشرہ چاھے جتنا بھی گناہ اور فساد سے پاک ھو پھر بھی برائی پورے طور سے اس سے دور نھیں ھوتی اور کھیں نہ کھیں گوشہ وکنار میں ایسے شریر افراد ضرور نظر آتے ھیں جو جوا وشراب کی طرف ھاتھ بڑھاتے نظر آتے ھیں یا لوگوں کے عمومی اموال و جائداد پر زبردستی ڈاکا ڈالتے ھیں اور ان پر قابض ھوجاتے ھیں یا لوگوں کی عزت وناموس

پر حملے کی فکر میں رھتے ھیں۔
اس لئے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد ایک ایسے شائستہ و لائق شخص کی ضرورت ھے جو گناہ گاروں اور فسادیوں کی الٰھی قانون کی روشنی میں تنبیہ کر کے اس طرح کی برائیوں اور آلودگیوں کو روکے۔ یہ اور اسی طرح کے امور وہ ھیں جو انسان کی دنیا سے مربوط ھیں، جن کی سرپرستی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد امام کے حوالے کی گئی ھے۔
مذکورہ امور کے مقابل کچہ دوسرے امور بھی ھیں جو دنیا میں اسلام کی ترقی اور پھیلاؤ سے مربوط ھیں اور جن کا تعلق انسان کے دین سے ھے۔ مثلاً امام کا ایک فریضہ یہ ھے کہ اسلحوں سے لیس ایک منظم اور مضبوط فوج تیار کرے جو نہ صرف اسلامی سرحدوں کو ھر طرح کے باھری حملوں سے محفوظ رکھے بلکہ اگر ممکن ھو تو جھاد کے ذریعہ توحید کا پیغام پوری دنیا میں پھیلا سکے۔
اب یھاں آپ یہ کھیں گے کہ پھر لوگ اپنے حرام و حلال اور دینی و علمی مسائل کس سے دریافت کریں گے، اور اس عھدہ کا ذمہ دار کون ھوگا؟ تو اس کے جواب میں علمائے اھل سنت کھیں گے کہ اصحاب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنھوں نے آنحضرت سے حرام و حلال کے احکام سیکھے ھیں اس طرح کے مسائل میں امت کے مرجع ھیں۔
اگر امام کی ذمہ داری ان ھی امور کی دیکہ بھال میں منحصر ھو، جنھیں ھم نے اھل سنت کی زبانی نقل کیا ھے، تو ظاھر ھے کہ ایسے امام کے لئے صرف تھوڑی سی لیاقت و شائستگی کے علاوہ کسی

بھی اخلاقی فضیلت اور انسانی کمال کی ضرورت نھیں ھے، چہ جائیکہ اس کے بارے میں وسیع علم اور خطا و گناہ سے بچانے والی عصمت کی شرط رکھی جائے۔

افسوس کہ امام کا معنوی و روحانی مرتبہ و منصب اھل سنت کی نظر میں رفتہ رفتہ اس قدر گر گیا کہ قاضی باقلانی جیسا شخص پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشین کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتا ھے کہ خلیفہ و امام پست ترین اخلاقی خصلتوں کی غلاظت اور اپنے کالے سیاسی کارناموں کے باوجود امت کی قیادت و رھبری کے منصب پر باقی رہ سکتا ھے! وہ کھتا ھے:

"لا یخلع الامام بفسقه و ظلمه بغصب الاموال و تناول النفوس المحترمة و تضییع الحقوق و تعطیل الحدود" (6)

یعنی امام اپنے فسق و فجور اور ظلم کے ذریعہ، لوگوں کے اموال غصب کر کے، محترم افراد کو قتل کر کے، حقوق کو ضائع کر کے اور الٰھی حدود و قوانین کو معطل کر کے بھی اپنے منصب سے معزول نھیں ھوتا بلکہ یہ امت پر ھے کہ اس کی برائیوں کو درست کریں اور اس کی ھدایت کریں!

اور ھمیں مزید تعجب نہ ھوگا اگر ھم محقق تفتازانی جیسے عالم کو خلیفہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارہ میں ایسے خیالات کا اظھار کرتے ھوئے دیکھیں، وہ لکھتے ھیں:

یہ ھرگز ضروری نھیں کہ امام لغزش اور گناہ سے پاک ھو یا امت کی سب سے اعلیٰ فرد شمار ھو۔ امام کی نافرمانی اور الٰھی احکام سے اس کی جھالت منصب خلافت سے اس کی معزولی کا سبب ھرگز نھیں ھوسکتی (7)

خلیفۂ اسلام کے بارے میں اس طرح کے فیصلوں اورنظریوں کی بنیاد یہ ھے کہ ان لوگوں نے امام کوایک عرفی اورانتخابی حاکم سمجھ لیا ھے۔کیونکہ ایک عرفی حاکم کے لئے بنیادی شرط یہ ھے کہ وہ نظام کو چلانے اورمعاشرہ میں آرام وسکون برقرار کرنے کی لازمی صلاحیت رکھتا ھواور فسادیوں کوکنٹرول کر سکے۔خوداس کا گناہ سے آلودہ ھونا یااس کی غلطیاں اس منصب کی راہ میں رکاوٹ نھیں بنتیں جس کے لئے وہ منتخب ھوا ھے۔

ب۔شیعہ علماء کانظریہ:

مذکورہ بالانظریہ کے مقابل ایک دوسرانظریہ بھی ھے جس پر شیعہ علماءتکیہ کرتے ھیں۔یہ نظریہ کھتا ھے کہ:امامت ایک طرح کی الٰھی ولایت ھے جو خداوند عالم کی جانب سے بندہ کو دی جاتی ھے۔واضح الفاظ میں یوں کھیں کہ:امامت،نبوت کی طرح ایک انتصابی منصب ھے اوراس کا عھدہ دارخودخدا کی طرف سے،معین ومنصوب ھوتا ھے۔

اس بنیاد پر امام رسالت ھی کا سلسلہ ھے فرق یہ ھے کہ پیغمبر شریعت کی بنیاد رکھنے والا اورآسمانی پیام لانے والا ھے اورامام شریعت کو بیان کرنے والا اوراس کا محافظ ونگھبان ھے۔امام،نزول وحی کے علاوہ تمام مراتب میں پیغمبراکرم(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)کے برابراور قدم بقدم ھے اوروہ تمام شرائط جوپیغمبر(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)کے لئے ضروری ولازم قرار دیے گئے ھیں(مثلاً اسلام کے معارف،اس کے اصول وفروع اوراحکام کا علم اورھرطرح کی خطاوگناہ سے اس کا محفوظ ھونا)بعینہ امام کے لئے بھی لازم وضروری ھیں۔

یہ نظریہ رکھنے والے معتقدھیں کہ: صحیح ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں کے لئےمکمل دستور حیات لائے اورانھوں نے اسلامی تعلیمات اوردین حق کے تمام کلیات لوگوں کے حوالے کردیئےلیکن پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات کے بعد کوئی تو ایسا شخص ھونا چاھئے جوان کلیات سے جزئی احکام کواستنباط کرے اورنکالےاور یہ کام علم (اوروہ بھی وسیع اورخدادادعلم) کے بغیرممکن نھیں ھے۔

صحیح ھے کہ اسلام کے تمام احکام کی تشریح پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں ھوئی ھے اور یہ احکام وحی الٰھی کے ذریعہ انھیں بتائے گئے ھیں۔لیکن مساعد حالات نہ ھونے یا روزانہ پیش آنے والے نئے مسائل کے حل کے لئے احکام کا بیان امام کے ذمہ بھی کیا گیا ھے،اوراس منصب کا سنبھالنا اللہ سے وابستہ اورمستند علم کے بغیرممکن نھیں ھے۔اسی لئے شیعوں کااعتقاد ھے کہ امام کوشریعت کے تمام امور سے واقف وآگاہ ھونا چاھئے۔(۸)

لیکن امام معصوم کیوں ھو؟تو جواب یہ ھے کہ شیعہ امام کوامت کامعلم ومربی جانتے ھیں اور تربیت سب سے زیادہ عملی پھلو رکھتی ھے اورمربی کے عمل کے ذریعہ انجام پانی چاھئے۔اگر مربی خود قانون توڑنے والا اورحدود کو پھچاننے والا نہ ھوتو لوگوں پر مثبت اثر کیسے ڈال سکے گا؟لھٰذا یہ نظریہ کھتا ھے کہ امت کے لئے ایسے شخص کی شناخت وسیع وخداداد علم اورھمہ جھت عصمت کے ذریعہ ھی ممکن ھے اورامام کوخدا کی جانب سے منصوب ھونا چاھئے۔

یہ دونظریے ھیں جوان دونوں گروھوں کے علماء کے ذریعہ بیان ھوئے ھیں۔اب ھم دیکھیں کہ ان میں سے کون سا نظریہ صحیح واستوار نیز قرآنی آیات اورپیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کی معتبر حدیث سے سازگار رہے۔

تیسری فصل

شیعہ نظریہ کی صحت کی دلیلیں

عقلی اورنقلی دلائل گواہی دیتے ہیں کہ امامت کا منصب نبوت کے مانند ایک الٰہی منصب ہے اور امام کو خدا کی جانب سے معین ہونا چاہئے اور جو شرائط پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے (وحی اور بانیٔ شریعت ہونے کے علاوہ) معتبر ہیں وہ امام میں ہونے چاہئے۔
اب ہم دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

پیش آنے والے نئے مسائل:

پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی حیات طیبہ میں اسلام کے اصول وفروع کے تمام کلیات بیان کردیئے تھے اور اسلام اسی طریقہ سے خود پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھوں تکمیل پایا۔لیکن کیا یہ اصول وکلیات امت کی علمی ضرورتوں کو پورا کرنے والی کسی مرکزی علمی شخصیت کے بغیر کافی ہیں؟ یہ طے شدہ بات ہے کہ کافی نہیں ہیں۔ بلکہ آنحضرت کے بعد ایسے معصوم پیشواؤں کی ضرورت ہے جو اپنے وسیع وبے پایان عظیم علم کے ذریعہ کلیات قرآن واصول اورسنت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روشنی میں پیش آنے والے مختلف مسائل میں امت کی علمی ضرورت کی تکمیل کریں۔خصوصاً ایسے مسائل میں جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں پیش نہیں آئے تھے اور نہ حضرت کے زمانہ میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی بعثت کے بعد رسالت کے تیرہ سال مکہ میں بت پرستوں کے خلاف جدوجہد میں بسر کئے۔اوراس عرصہ

میں حالات اور ماحول سازگار نہ ھونے کی وجہ سے آپ الٰھی شریعت کے احکام بیان کرتے ھیں کامیاب نہ ھوئے بلکہ آپ نے اپنی پوری توجہ اسلامی اصول ومبدا اور معاد یعنی توحید و قیامت کے سلسلہ میں لوگوں کا ذھن ھموار کرنے میں صرف کی، اور چونکہ حرام وحلال اور الٰھی فرائض وسنن بیان کرنے کے حالات نھیں تھے، لھذا آپ نے احکام کے اس حصہ کو بعد کے لئے اٹھا رکھا۔

جب آنحضرت مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے سامنے مسائل ومشکلات کا ایک لشکر تھا۔ مدینہ میں آپ کی زندگی دس سال سے زیادہ نہ رھی لیکن آپ نے اسی مدت میں ستائیس مرتبہ خود بت پرستوں نیز مدینہ اور خیبر کے یھودیوں کے خلاف جنگوں میں شرکت فرمائی۔ دوسری طرف منافقوں کی سازشوں نیز اھل کتاب سے مناظرہ ومجادلہ میں بھی آپ کا بڑا قیمتی وقت صرف ھوا۔

یہ حادثات و واقعات سبب بنے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی رسالت کے دوران زیادہ تر اسلام کے فروع واحکام کے کلیات بیان کریں اور ان کلیات سے دوسرے احکام کے استنباط واستخراج کا کام دوسرے شخص کے حوالے کیا جائے۔

اگر قرآن یہ فرماتا ھے کہ

"الیوم اکملت لکم دینکم" (9)

تو اس سے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اسلام کی اس وقت کی حالت وکیفیت کو دیکھتے ھوئے آیت کے نزول یعنی دس ھجری کے وقت مراد یہ ھے کہ توحید وقیامت سے متعلق

معارف وعقائداورفروع واحکام کے تمام اصول وکلیات آیت کے نزول کے وقت خود پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ھاتھوں تکمیل ھوگئے اوراس اعتبار سے دین کے ارکان میں کوئی نقص باقی نھیں رھااوریھی کلیات صبح قیامت تک امت کوپیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کرنے میں بنیادواساس کا کام کریں گے۔

اب یہ دیکھنا چاھئے کہ کون ساشخص ان اصول وکلیات کے ذریعہ اسلامی معاشرہ کی تمام ضرورتوں اورمسائل کا جواب دے سکتا ھے۔احکام سے متعلق قرآن میں ذکرشدہ آیات اور پیغمبراکرم کی محدوداحادیث کے ذریعہ صبح قیامت تک پیش آنے والے بےشمارمسائل کاحل اوراحکام کا استنباط کرنا بھت ھی دشوار اور پیچیدہ کام ھے جو عام افراد کے بس کا نھیں ھے ۔کیونکہ قرآن مجید میں فقھی وشرعی احکام سے متعلق آیات کی تعداد تین سو سے زیادہ نھیں ھے۔اسی طرح سے حلال وحرام اورفرائض سے متعلق آنحضرت کی احادیث کی تعداد چارسو سے زیادہ نھیں ھے اور ایک عام انسان اپنے محدودعلم کے ذریعہ ان محدود مدارک سے مسلمانوں کے روز افزوں مسائل و مشکلات کا حل نکال نھیں سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ایک ایسے لائق اورشائستہ شخص کی ضرورت ھے جواپنے الٰھی اورغیبی علم کے ذریعہ ان محدود دلائل سے الٰھی احکام نکال کرامت کے حوالے کرسکتا ھو۔

ساتھ ھی ساتھ ایسا شخص اپنے اس وسیع ولامحدودعلم کی وجہ سے گناہ وخطا سے محفوظ بھی ھونا چاھئے تاکہ لوگ اس پراعتماد کرسکیں اورایسے شخص کوخدا کے علاوہ کوئی اورنھیں جانتا لھذا وھی اسے معین بھی فرمائے گا۔

تکمیل دین کی دوسری نوعیت

یھاں ایک دوسری بات بھی کھی جاسکتی ھے،اور وہ یہ ھے کہ آیت اکمال جو اسلام کی تکمیل سے متعلق ھے اسلام کی بقادوام کو بیان کررھی ھے۔کیونکہ یہ آیت کریمہ اسلامی محدثین کی متعدد ومتواتر روایات کے مطابق غدیر کے دن حضرت علی ں کی ولایت وخلافت کے اعلان کے بعد نازل ھوئی ھے۔اب رھی فرائض ومحرمات اور دوسرے احکام سے متعلق تکمیل دین کی بات تو یہ اس آیت کے مقصد سے باھر کی چیز ھے۔اس حصہ میں اسلام کے مسلمات کو مدنظر رکھتے ھوئے یہ کھا جانا چاھئے کہ اس میں کوئی کلام نھیں ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد وحی الٰھی کا سلسلہ منقطع ھوگیا اور اب کوئی امین وحی کسی اسلامی حکم کو لے کر نھیں آئے گا، بلکہ انسان کو صبح قیامت تک جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب جبرئیل امین رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لا چکے۔دوسری طرف ھم دیکھتے ھیں کہ دنیا کے تمام ھونے تک اسلامی معاشرہ کو پیش آنے والے مسائل کا حکم بیان کرنے کے لئے فقھی دلائل ھمارے پاس کافی نھیں ھیں بلکہ بھت سے احکام قرآن وحدیث میں بیان ھی نھیں کئے گئے ھیں۔

ان دو باتوں کو مدنظر رکھتے ھوئے ھم یہ کھنے پر مجبور ھیں کہ تمام الٰھی احکام خود پیغمبر اکرم کے زمانہ میں آچکے تھے اور آپ کو ان کی تعلیم دی جا چکی تھی۔اب چوں کہ رسالت کی مدت بھت ھی مختصر تھی،ساتھ ھی ھر روز کے مسائل اور دشواریاں،نتیجہ میں آپ ان تمام احکام کی تبلیغ

کرنے میں کامیاب نھیں ھوئے لھذا آپ نے وہ تمام تعلیمات الٰھی اور جو کچہ بھی آپ نے وحی کے ذریعہ الٰھی احکام اور اسلامی اصول وفروع کی شکل میں حاصل کیا تھا سب کچہ اپنے اس وصی وجانشین کے حوالے کردیا اور اسے سکھا دیا، جوخود آنحضرت کی طرح خطا وغلطی سے بری اور محفوظ تھا۔تا کہ وہ آپ کے بعد یہ تعلیمات اور احکام رفتہ رفتہ امت کو بتائے۔ظاھر ھے کہ ایسے شخص کی شناخت جو اس قدر وسیع علم رکھتا ھو اور ھر طرح کی خطا ولغزش سے پاک ھو صرف پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تعارف اور اللہ کی جانب سے نصب وتعیین کے ذریعہ ھی ممکن ھے۔امت انتخابات کے ذریعہ ایسے کسی شخص کو نھیں پھچان سکتی۔

یہ بھی عرض کردوں کہ ھم جو یہ کھتے ھیں کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کچہ امت سے بیان نہ کرسکے وہ انھوں نے اپنے وصی وجانشین کو تعلیم دے دیا تو اس سے مراد وہ معمولی تعلیم نھیں ھے جو ایک شاگرد اپنے استاد سے چند برسوں میں حاصل کرتا ھے کیوں کہ اگر ایسا ھوتا تو پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شخص کو اس طرح کی تربیت دینے کے بجائے ایک گروہ یا بھت سے لوگوں کی تعلیم وتربیت فرماتے۔جب کہ یہ تعلیم ایک غیر معمولی تعلیم تھی جس میں آنحضرت نے اپنے وصی کی روح وقلب پر تصرف فرما کر تھوڑی ھی دیر میں اسلام کے تمام حقائق وتعلیمات سے انھیں آگاہ کردیا اور کوئی چیز پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشین سے مخفی وپوشیدہ نھیں رہ گئی۔

آخر میں یہ یاد دھانی بھی کرادوں کہ جب اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلا تو مسلمان نئے نئے حالات سے دوچار ھوئے جن سے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عھد میں

سابقہ نھیں پڑا تھا اور آنحضرت نے ان نئے حالات اور حادثات کے سلسلہ میں کوئی بات نھیں بتائی تھی۔

قرآن وحدیث کے اصول وکلیات سے اس طرح کے نئے حالات ومسائل کا حکم کشف کرنا اور نکالنا بھت ھی پیچیدہ اور اختلاف انگیز ھے۔اس سلسلہ میں تکمیل شریعت کا تقاضا یہ ھے کہ خاندان وحی سے وابستہ کوئی فرد ان نئے مسائل کا حکم قرآن وحدیث سے استنباط کرے یا ان کا حکم اس وھبی علم کے ذریعہ بیان کرے جو آنحضرت نے اس کے حوالے کیا ھے۔

اھل سنت معاشرہ کی ایک مشکل یہ بھی ھے کہ احکام سے متعلق قرآن کریم کی محدود آیات اور پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی چار سو حدیثوں سے ھی اسلام کے تمام احکام کا استنباط واستخراج کرنا چاھتے ھیں لیکن جونکہ بھت سے مواقع پر ناتوانی کا احساس کرتے ھیں اور مذکورہ بالا دلیلوں کو کافی نھیں پاتے لھٰذا قیاس واستحسان جن کی کوئی محکم اساس وبنیاد نھیں ھے ،کا سھارا لے کر امت کی ضرورتوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ھیں۔ وہ خود جانتے ھیں کہ ایک مورد کا دوسرے مورد پر قیاس یا فقھی استحسان کے ذریعہ کسی مسئلہ کا حکم بیان کرنا کوئی صحیح بنیاد نھیں رکھتا۔لیکن اگر امت میں کوئی ایسا شائستہ ولائق شخص ھو جو اپنے وسیع علم کے ساتھ اس قسم کے مسائل کا حکم ایک خاص طریقہ سے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے حاصل کر کے امت کے حوالے کرے اور گمان وشک پر عمل کی اس بے سروسامانی کا خاتمہ کردے تو یہ روش شریعت کی تکمیل اور لوگوں کے حقیقت تک پھنچنے کی راہ میں زیادہ موثر ثابت ھوگی۔

پھر بھی گنتی کے چند نادر موارد میں قیاس واستحسان کی ضرورت پیش آئی تو ھم یہ کھہ سکتے ھیں کہ ان جزئی موارد میں اسلام نے آسانی کے لئے ان پر عمل کرنے کی اجازت دے دی ھے ۔لیکن اگر شریعت کے پورے پیکر کو ظن وگمان پر استوار کریں اور ایسے قوانین دنیا کے حوالے کریں جن کی بنیاد حدس وگمان اور استحسان اور ایک مورد کا دوسرے مورد پر قیاس ھوتو ایسی صورت میں ھم نے ایسے اسلامی احکام اور اسلام کا ایسا حقوقی وجزائی مکتب فکر اور اخلاقی نظام دنیا کے سامنے پیش کیا ھے جس کی اساس وبنیاد ھی ناھموار اور پھس پھسی ھے کیا ایسی صورت میں ھم یہ توقع رکہ سکتے ھیں کہ دنیا کے لوگ ایسے اسلام کے حقوقی وجزائی احکام پر عمل کریں گے جس کے بیشتر احکام وحی الٰھی سے دور کا بھی واسطہ نھیں رکھتے ۔

خلفاء امت کی لاعلمی

تاریخ اسلامی امت کے حکام وخلفاء کی اسلامی اصول وفروع سے لاعلمی کے بھت سے واقعات اپنے دامن میں لئے ھوئے ھے ۔علمی محاسبات یہ تقاضا کرتے ھیں کہ امت کے درمیان ایک عالم وآگاہ امام وپیشوا کا وجود ضروری ھے جو اسلامی احکام کا محافظ اور ان کا خزانہ دار ھو اور مستقل الٰھی تعلیمات کو لوگوں تک پھنچاتا رھے ۔ھم یھاں پر خلفا کی لاعلمی اور اسلام کے بنیادی احکام سے ان کی جھالت کے چند نمونے پیش کرتے ھیں :

1۔حضرت عمر نے اصحاب کے مجمع میں ایک شوھر دار حاملہ عورت کو جو زنا کی مرتکب ھوئی تھی سنگسار کرنے کا حکم دیا لیکن آخر کار حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی راھنمائی کے ذریعہ

یہ حکم تبدیل کیا گیا۔ کیونکہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ماں نے گناہ کیا ہے تو وہ قصوروار ہے لیکن بچہ نے کیا قصور کیا ہے جو ابھی اس کے رحم میں ہے؟

2۔ خلیفہ نے ایک ایسے شادی شدہ شوہر کو جس کی بیوی دوسرے شہر میں رہتی تھی زنا کے جرم میں سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ جبکہ ایسے شخص کے لئے جس کی بیوی اس سے دور ہو اللہ کا حکم سو تازیانہ (کوڑے) کی سزا ہے، سنگسار نہیں ہے۔ چنانچہ یہ حکم بھی حضرت علی علیہ السلام کے ذریعہ تبدیل کیا گیا۔

3۔ پانچ بدکار مردوں کو خلیفہ کے پاس لایا گیا اور گواہی دی گئی کہ یہ لوگ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ خلیفہ نے حکم دیا کے سب کو ایک طرف سے سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ امام علی علیہ السلام اس جگہ موجود تھے آپ نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک کی سزا جدا جدا ہے۔ ایک کافر ذمی ہے، اس نے اپنے شرائط پر عمل نہیں کیا ہے۔ وہ قتل کیا جائے گا۔ دوسرا شادی شدہ مرد ہے جسے سنگسار کیا جائے گا۔ تیسرا جوان آزاد ہے اور غیر شادی شدہ ہے، اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ چوتھا غیر شادی شدہ غلام ہے، اسے آزاد کی آدھی سزا یعنی پچاس کوڑے لگائے جائیں گے، اور پانچواں شخص دیوانہ ہے، اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

4۔ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں ایک مسلمان نے شراب پی لی تھی لیکن اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ایسے لوگوں میں زندگی بسر کرتا رہا ہے جو سب کے سب شراب پیتے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اسلام میں شراب پینا حرام ہے۔ خلیفہ اور ان کے وزیر حضرت عمر نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا اور اس مشکل کو حل کرنے میں ناکام رہے آخرکار مجبور ہو کر انھوں نے

حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کیا۔ آپ (※ ع) نے فرمایا: اس شخص کومھاجرین وانصار کے مجمع میں پھراوٴ اگر ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی یہ کھہ دیا کہ اس نے تحریم شراب کی آیت اسے سنائی ھے تو اس پر حجت تمام ھے اور اس پر حد جاری ھوگی ورنہ اسے معذور سمجہ کر چھوڑ دیا جائے گا۔

5۔ایک شادی شدہ عورت کو زنا کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور اسے سنگسار کرنے کا حکم صادر کیا گیا۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اس عورت سے مزید تحقیق کی جائے،شاید اس کے پاس اس جرم کا کوئی عذر موجود ھو۔عورت کو دوبارہ عدالت میں پیش کیا گیا۔اس نے اس جرم کے ارتکاب کی وجہ یوں بیان کی کہ میں اپنے شوھر کے اونٹوں کو چرانے صحرا لے گئی تھی ۔اس بیابان میں مجہ پر پیاس کا غلبہ ھوا میں نے وھاں موجود شخص سے بھت منت سماجت کی اور اس سے پانی مانگا لیکن وہ ھر بار یہ کھتا تھا کہ تم میرے آگے تسلیم ھوجاوٴتو میں تمھیں پانی دوں گا۔جب میں نے محسوس کیا کہ پیاس سے مرجاوٴں گی تو میں مجبوراًاس کی شیطانی ھوس کے آگے تسلیم ھوگئی۔

اس وقت حضرت علی ں نے تکبیر بلند کی اور فرمایا:”اللہ اکبر فمن الضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ “یعنی اگر کوئی اضطرار اور مجبوری کی حالت میں کوئی غلط کام کرے تو اس پر کوئی گناہ نھیں ھے۔

اس طرح کے واقعات خلفاء کی تاریخ میں اس قدر زیادہ ھیں کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ھے۔ان تمام حوادث کا حکم بیان کرنے کا ذمہ دار کون ھے۔اس طرح کے حوادث پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں پیش نھیں آئے تھے کہ امت ان کا حکم مرکز

وحی یعنی خود آنحضرت سے حاصل کرلیتی ۔ پھر آنحضرت کی رحلت کے بعد اس قسم کے احکام بیان کرنے والا اور الٰھی احکام کا محافظ وخزانہ دار کسے ھونا چاھئے ۔کیا یہ کھنا درست ھوگا کہ خداوند عالم نے ایسے حالات میں امت کو خود اس کے حال پر چھوڑ دیا ھے اور اپنے معنوی فیضان کو امت سے دور کرلیا ھے ۔ چاھے امت کی نادانی وجھالت کی وجہ سے لوگوں کی ناموس خطرے میں پڑ جائے اور احکام حق کی جگہ باطل احکام لے لیں ۔(10)

چوتھی فصل

پیغمبر امامت کو الٰھی منصب سمجھتے ھیں

اس میں کوئی کلام نھیں ھے کہ امت کی رھبری کا مسئلہ مسلمان معاشرہ کے لئے اساسی اور حیاتی حیثیت رکھتا ھے۔ چنانچہ اسی مسئلہ پر اختلاف پیدا ھوا اور اس نے امت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کے درمیان گھرا اختلاف پیدا کر دیا۔

اب یہ سوال پیدا ھوتا ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تمام چیزوں کے بارے میں واجب، مستحب ،حرام و مکروہ سے متعلق تو ساری باتیں بیان فرمائیں لیکن امت کی قیادت و رھبری اور حاکم کے خصوصیات سے متعلق کوئی بات کیوں بیان نھیں کی؟ کیا انسان یہ سوچ سکتا ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اتنے اھم موضوع پر کوئی توجہ نہ دی ھوگی بلکہ خاموشی اختیار کی ھوگی اور امت کو بیدار نہ کیا ھوگا؟!

علمائے اھل سنت فرماتے ھیں کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیادت و امامت کے طریقہ کے سلسلہ میں نفیاً و اثباتاً کوئی بات نھیں بیان کی اور یہ واضح نھیں کیا کہ قیادت و رھبری کا مسئلہ انتخابی ھے یا تعیینی ھے۔

سچ مچ کیا عقل باور کرتی ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس انتھائی اھم اور حیاتی مسئلہ پر خاموشی اختیار کی ھوگی اور قضیہ کے ان دونوں پھلوں سے متعلق کوئی اشارہ نہ کیا ھوگا؟

عقل کے فیصلہ سے آگے بڑھ کر تاریخ اسلام کا جائزہ بھی اس نظریہ کے خلاف گواھی دیتا ھے۔ اور یہ بات صاف ظاھر ھوتی ھے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مختلف موقعوں پر یہ یاددھانی کی ھے کہ میرے بعد امت کی قیادت و رھبری کا مسئلہ خدا سے مربوط ھے اور

وہ اس سلسلہ میں کوئی اختیار نھیں رکھتے ۔یھاں ھم تاریخ اسلام سے چند نمونے پیش کرتے ھیں:

جب مشرکوں کے ایک قبیلہ کے سردار"اخنس" نے اس شرط پر پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حمایت کا اظھار کیا کہ اپنے کے بعد امت کی قیادت وسر پرستی آپ ھمارے حوالے کر جائیں گےتو پیغمبر اسلام نے اسے جواب دیا کہ" الامر الٰی اللہ یضعہ حیث یشاء" یعنی امت کی قیادت کا مسئلہ خدا سے مربوط ھے وہ جسے بھتر سمجھے اس امر کے لئے منتخب کرے گا۔قبیلہ کا سردار یہ بات سن کر مایوس ھو گیا اور اس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جواب میں کھلا یا کہ یہ بات بالکل درست نھیں ھے کہ رنج وزحمت میں اٹھاؤں اور قیادت ورھبری کسی اور کو ملے!(11)

تاریخ اسلام میں یہ واقعہ بھی ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے "یمامہ" کے حاکم کو خط لکہ کر اسے اسلام کی دعوت دی اس نے بھی "اخنس" کے مانند آنحضرت (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے آپ کی جانشینی کا تقاضا کیا تو آنحضرت نے اسے انکار میں جواب دیتے ھوئے فرمایا:"لا ولا کرامۃ" یعنی یہ کام عزت نفس اور روح کی بلندی سے بعید ھے۔(12)

امت کی قیادت ورھبری کا مسئلہ اتنا اھم ھے کہ اس کی اھمیت کو صرف ھم ھی نے محسوس نھیں کیا ھے بلکہ صدر اسلام میں بھی یہ مسئلہ بھت سے لوگوں کی نظر میں بڑی اھمیت رکھتا تھا۔مثلا جس وقت خلیفہ دوم، ابولؤلؤ کی ضرب سے زخمی ھوئے اور ان کے بیٹے عبد اللہ بن عمر نے اپنے باپ کو مرتے ھوئے دیکھا تو اپنے باپ سے کھا جتنی جلدی ھو سکے اپنا ایک جانشین معین کیجئے

اور امت محمدی کو بے حاکم و بے سرپرست نہ چھوڑئے۔

بالکل یھی پیغام ام المومنین عائشہ نے بھی خلیفہ دوم کو کھلایا اور ان سے درخواست کی کہ امت محمدی کے لئے ایک محافظ و نگھبان معین کر جائیں۔اب کیا یہ کھنا صحیح ھوگا کہ ان دو شخصیتوں نے امت کی قیادت و رھبری کے مسئلہ کی اھمیت کو تو اچھی طرح محسوس کرلیا تھا لیکن رسول اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان دو افراد کے بقدر بھی اس مسئلہ کی اھمیت کو سمجھ نھیں پائے تھے؟!

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدینہ کی دس سالہ زندگی کا ایک ھلکا سا جائزہ لینے کے ساتھ ھی یہ بات پوری طرح ثابت ھو جاتی ھے کہ آنحضرت جب بھی کھیں جانے کے لئے مدینہ سے نکلتے تھے کسی نہ کسی کو مدینہ میں اپنا جانشین معین کر جاتے تھے، تاکہ اس مختصر سی مدت میں بھی جب پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ میں تشریف نھیں رکھتے لوگ بے سرپرست اور بے پناہ نہ رھیں۔کیا یہ بھتر ھے کہ جو جانشین معین کرنے کی اھمیت سے آگاہ ھو اور یہ جانتا ھو کہ حتّٰی مختصر مدت کے لئے بھی جانشین معین کئے بغیر مدینہ کو ترک نھیں کرنا چاھئے۔وہ دنیا کو ترک کرے اور اپنا کوئی جانشین معین نہ کرے یا کم از کم قیادت و رھبری کی شکل و نوعیت اور حاکمیت کے طریقہ کار کے بارے میں کچھ نہ کھے؟!

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کسی علاقہ کو فتح بھی کرتے تھے تو اسے ترک کرنے سے پھلے وھاں ایک حاکم معین فرماتے تھے پھر ان حالات میں یہ کیسے کھا جاسکتا ھے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا جانشین معین کرنے میں غفلت سے کام لیا ھوگا اور اس

کے لئے میں کوئی فکر نہ کی ھوگی ، جوان کے بعد امت کی قیادت ورھبری اپنے ھاتھ میں لے سکے اور اسلام کے نو پا درخت کی نگھبانی وسر پرستی کر سکے؟!

نبوت و امامت باھم ھیں

متواتر احادیث اور اسلام کی قطعی تاریخ صاف گواھی دیتی ھیں کہ نبوت اور امامت دونوں کا اعلان ایک ھی دن ھوا اور جس روز پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا کی طرف سے اپنے خاندان والوں کے درمیان اپنی رسالت کا اعلان کرنے پر مامور ھوئے تھے اسی روز آپ نے اپنا خلیفہ وجانشین بھی معین فرمادیا تھا۔

اسلام کے گرانقدر مفسرین و محدثین لکھتے ھیں کہ جب آیت "و انذر عشیرتک الاقربین" (شعراء/214) نازل ھوئی تو پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی علیہ السلام کو خاندان والوں کے لئے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا جنھیں آنحضرت نے مھمان بلایا تھا۔حضرت علی علیہ السلام نے بھی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے کھانا تیار کیا اور بنی ھاشم کی پینتالیس شخصیتیں اس مجلس میں اکٹھا ھوئیں۔ پھلے روز ابولھب کی بیھودہ باتوں کی وجہ سے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی رسالت کا پیغام سنانے میں کامیاب نھیں ھوئے۔دوسرے روز پھر یہ دعوت کی گئی اور مھمانوں کے کھانا کھالینے کے بعد پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی جگہ کھڑے ھوئے اور خداوند عالم کی حمد وثنا کرنے کے بعد فرمایا:

میں تم لوگوں اور دنیا کے تمام انسانوں کے لئے خدا کا پیغامبر ھوں اور تم لوگوں کے لئے دنیا وآخرت کی بھلائی لایا ھوں۔ خدا نے مجھے حکم دیا ھے کہ میں تم لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دوں تم میں سے جو شخص اس کام میں میری امدد کرے گا وہ میرا وصی اور جانشین ھوگا۔

اس وقت حضرت علی بن ابیطالب ں کے علاوہ کسی نے بھی اٹہ کر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نصرت و مدد کا اعلان نھیں کیا۔ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی علیہ السلام کو بیٹہ جانے کا حکم دیا اور دوبارہ اور تیسری بار بھی اپنا جملہ دھرایا اور ھر بار حضرت علی ں کے علاوہ کسی نے آپ کی حمایت اور اس راہ میں آپ کی نصرت وفدا کاری کا اظھار نھیں کیا۔ اس وقت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے خاندان والوں کی طرف رخ کر کے فرمایا:

"ان ھذا اخی و وصی و خلیفتی فیکم فاسمعوا و اطیعوا"

یعنی علی (ع) میرا بھائی اور تمھارے درمیان میرا وصی و جانشین ھے، پس تم پر لازم ھے کہ اس کا فرمان سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (13)

تاریخ کا یہ واقعہ اس قدر مسلّم ھے کہ ابن تیمیہ جس کا خاندان اھل بیت (ع) سے عناد سب پر ظاھر ھے، کے علاوہ کسی نے بھی اس کی صحت سے انکار نھیں کیا ھے۔ یہ حدیث حضرت علی ں کی امامت کی دلیل ھونے کے علاوہ اس بات کی سب سے اھم گواہ ھے کہ امامت کا مسئلہ امت کے اختیار میں نھیں ھے۔ اس سے یہ بھی ظاھر ھوتا ھے کہ جانشین کا اعلان اس قدر اھم تھا کہ نبوت وامامت دونوں منصبوں کے مالک افراد کا اعلان ایک ھی دن پیغمبر (صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم) کے خاندان والوں کے سامنے کیا گیا۔

یہ واقعہ تین بعثت کو پیش آیا اور اس وقت تک پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت مخصوص افراد کے ذریعہ لوگوں تک پھنچائی جاتی تھی اور تقریباً 50 پچاس افراد اس وقت تک مسلمان ھوئے تھے۔

پانچویں فصل

اسلامی قوانین اور کتاب خدا معصوم کی تفسیر سے بے نیاز نھیں

اسلامی قوانین چاهے جتنے بھی روشن وواضح هوں پھر بھی ان کی توضیح وتفسیر ضروری هے بالکل یوں هی جیسے آج ملکوں کے قوانین چاهے جس قدر روزمرہ کی زبان میں تنظیم کئے جائیں پھر بھی ان کی وضاحت کے لئے زبردست قسم کے ماهروں کی ضرورت هوتی هے جوان کے اهم پھلوؤں کو واضح کرسکیں ۔اور اسلامی قوانین بھی حتیٰ وہ بھی جو پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے نقل هوئے هیں توضیح وتفسیر سے مستغنٰی اور بے نیاز نهیں هیں ۔اس کے گواہ مسلمانوں کے درمیان وہ سیکڑوں اختلافات هیں جوقرآنی آیات اور اسلامی احادیث کے سلسلہ میں نظرآتے هیں ۔

کیا اسلام کے ابدی وجاودانی قوانین کو ایسے کسی پیشوا کی ضرورت نهیں هے جو پیغمبر اکرم کے علوم کا وارث هو اور اختلاف کے موارد میں سب کے لئے حجت هو؟اور کیا اختلافات دور کرنے فاصلوں کو کم کرنے اور اسلامی اتحاد برقرار کرنے کے لئے ایسے جانشین کا تعین لازم و ضروری نهیں تھا؟

حضرت عمر کی خلافت کے دوران ایک شخص نے اسلامی عدالت میں شکایت کی کہ میری بیوی کے یهاں چھ هی مهینہ میں بچہ پیدا هوگیا هے۔قاضی نے حکم دے دیا کہ لے جاؤ اس عورت کو سنگسار کردو۔راستہ میں اس عورت کی نگاہ حضرت علی علیہ السلام پر پڑی اس نے چیخ کر کها :اے ابوالحسن میری فریاد کو پهنچئے ۔میں ایک پاک دامن عورت هوں اور میں نے اپنے شوهر کے علاوہ کسی سے قربت نهیں کی هے ۔حضرت علی علیہ السلام جب واقعہ سے آگاہ هوئے تو انهیں یہ سمجھنے میں دیر نهیں لگی کہ قاضی نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی هے۔آپ(※ ع) نے

ماموروں سے مسجد واپس چلنے کو کھا اور مسجد میں جا کر خلیفہ سے پوچھا کہ تم نے یہ کیسا فیصلہ کیا ھے؟ خلیفہ نے کھا کہ شوھر سے اس عورت کی قربت کو صرف چھ ماہ گزرے ھیں۔ کیا کھیں چھ مھینے میں بچہ پیدا ھوتا ھے؟ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم نے قرآن نھیں پڑھا جس میں آیا ھے" وحملہ وفصالہ ثلاثون شھرا" (14) یعنی اس کا حمل اور دودہ پلانے کا زمانہ تیس ماہ ھے۔ خلیفہ نے جواب دیا درست ھے۔ پھر حضرت علی ں نے فرمایا: کیا قرآن نے دودہ پلانے کا زمانہ دو سال نھیں معین کیا ھے کہ ارشاد ھوتا ھے:" والولدات یرضعن اولادھن حولین کاملین" (15) یعنی مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودہ پلائیں۔ خلیفہ نے جواب دیا: سچ فرمایا: اس پر حضرت علی ں نے فرمایا: کہ اگر دودہ پلانے کے چوبیس مھینوں کو تیس مھینوں سے کم کرو تو چھ ھی ماہ باقی رھتے ھیں۔ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ حاملگی کی کم سے کم مدت چھ ماہ ھے اور عورت اس مدت میں سالم بچہ پیدا کر سکتی ھے۔

حضرت امیر المومنین علی ں نے دو آیتوں کو باھم ضمیمہ کر کے ایسا قرآنی حکم استنباط کیا جس سے اصحاب واقف نھیں تھے اب کیا یہ کھا جا سکتا ھے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس الٰھی کتاب قرآن مجید کی وضاحت کے لئے جو ایک جاوید رھنما اور ابدی قانون کی حیثیت رکھتی ھے اپنے بعد کوئی اقدام نھیں فرمایا ھے؟

ممکن ھے یہ کھا جائے کہ ایسے نادر مسئلہ میں اختلاف سے جو انسانی زندگی میں بھت کم پیش آتا ھے پورے اسلامی معاشرہ کے اتحاد کو خطرہ لاحق نھیں ھو سکتا، تو اس کے جواب میں یہ کھا جائے گا کہ اختلاف اس طرح کے نادر مسائل سے مخصوص نھیں ھے بلکہ یہ اختلاف مسلمانوں

کے روزمرہ اور بنیادی فرائض و وظائف سے بھی تعلق رکھتا ھے اور ظاھر ھے کہ ھر روز کے مسائل میں مسلمانوں کے اختلاف وتفرقہ سے آنکھیں بند نھیں کی جاسکتیں اور یہ تصور نھیں کیا جاسکتا کہ اتنے سارے مسائل میں اختلافات سے مسلمانوں کے اتحادو یکجھتی پر کوئی ضرب نھیں پڑتی ھے۔

قرآن مجید نے اپنے سورہ مائدہ آیت/6 میں وضو کرنے کی کیفیت مسلمانوں سے بیان کی ھے اور صدر اسلام میں مسلمان ھر روز اپنی آنکھوں سے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وضو کرتے ھوئے دیکھتے تھے، لیکن پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد قرآن مجید دنیا کے دور دراز کے علاقوں میں پھیلا اور علماء کے اوپر قرآنی آیات میں اجتھاد و تفکر کا دروازہ کھلا اور فقھی احکام سے متعلق آیات پر رفتہ رفتہ بحث و تحقیق ھوئی لیکن سرانجام کیفیت وضو سے متعلق آیت کو سمجھنے میں اختلاف پیدا ھوگیا اور آج یہ اختلاف باقی اور رائج ھے کیوں کہ شیعہ علماء اپنے ھاتھوں کو اوپر سے نیچے کی طرف دھوتے ھیں اور پیروں کا مسح کرتے ھیں لیکن علمائے اھل سنت ان کے بالکل برخلاف عمل کرتے ھیں۔

اگر امت کے درمیان ایک ایسا معصوم اور تمام اصول وفروع سے آگاہ رھبر موجود ھو کہ سب کے سب اس کی بات تسلیم اور اس کی پیروی کرتے ھوں تو ھرگز ایسا اختلاف جو مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کردے پیش نھیں آئے گا اور پورا اسلامی معاشرہ اپنے روزمرہ کے فرائض کی انجام دھی میں یک رنگ و یک شکل ھوگا۔

قرآن کی تفسیر میں اختلاف

اسلام کے جزا وسزا کے قوانین میں ایک چور کے ھاتھ کاٹنے کا قانون ھے جو اپنے شرائط و خصوصیات کے ساتھ فقھی کتابوں میں درج ھے ابھی ابھی دو تین صدی پھلے تک جبکہ اسلام ایک طاقت کی شکل میں حاکم تھا اسلامی حکومتیں اپنے قوانین قرآن سے حاصل کرتی تھیں اور جبکہ مغربی قوانین ابھی اسلامی سرزمینوں تک نھیں پھنچے تھے چور کی تھا سزا اس کا ھاتھ کاٹنا تھی ۔لیکن افسوس کہ یہ ایک چھوٹا سا اور تقریبا روزمرہ کا مورد بھی ان موارد میں سے ھے کہ اسلام کی چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کی حد معین کرنے کے سلسلہ میں ایک نقطہ پر متحد نھیں ھو سکے

معتصم عباسی کے زمانہ میں جبکہ ھجرت پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دو سو سال سے زیادہ گزر چکے تھے ،علماء نے اسلام کے درمیان ھاتھ کاٹنے سے متعلق آیت کی تفسیر میں اختلاف پیدا ھو گیا۔وہ لوگ یہ طے نھیں کر پا رھے تھے کہ چور کا ھاتھ کھاں سے کاٹنا چاھئے ۔ایک کھتا تھا: ھاتھ کلائی سے کاٹا جائے گا۔دوسرا کھتا تھا: ھاتھ کھنی سے کاٹا جائے گا۔تیسرا کھتا تھا:۔۔۔۔۔۔۔آخر کار خلیفۂ وقت نے شیعوں کے نویں امام حضرت امام محمد تقی علیہ السلام سے بھی دریافت کیا۔آپ (ع) نے فرمایا: چور کے ھاتھ کی صرف چار انگلیاں کاٹی جائیں گی ۔جب آپ (ع) سے پوچھا گیا کہ اس کی دلیل کیا ھے تو آپ (ع) نے فرمایا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرمایا ھے:" وان المساجد اللہ" سجدہ کی جگھیں خدا کے لئے ھیں اور اس سے متعلق ھیں۔آپ (ع) نے فرمایا: ان میں سے ایک ھتھیلی بھی ھے جسے سجدہ کے وقت زمین

پرٹکانا ضروری ھے اور جو چیز خدا سے متعلق ھو اسے کاٹا نھیں جا سکتا۔
اگر امت کے درمیان ایک ایسا قرآن شناس موجود ھو جو قرآن کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاھی رکھتا ھو اور فکری اعتبار سے مسلمانوں کا ملجا و مرکز قرار پائے اور تمام مسلمان اس کی طرف رجوع کریں تو ظاھر ھے کہ بھت سے اختلافات آسانی سے دور ھو جائیں گے اور امت ایک ھی سمت میں ایک ھی مقصد کے ساتھ قدم بڑھائے گی۔ نہ مسلمانوں کا قیمتی وقت ضائع ھوگا اور نہ ان میں خطرناک اور خونریز اختلاف ٹکراؤ پایا جائے گا۔
قرآن مجید ھر طرح کے استنباط اور صحیح اسلام کو سمجھنے کے لئے اساسی و بنیادی ماخذ ھے اور کوئی چیز اس عظیم کتاب کی برابری نھیں کرسکتی۔ اگر دوسرے مأخذ میں باھم اختلاف نظر آئے مثلا اگر پیغمبر اکرم کی دو حدیثیں باھم ٹکراؤ رکھتی ھوں تو ھم اس حدیث کو اپنائیں گے جو قرآن کے مطابق ھوگی۔
لیکن کیا دلالت اور بیان کے اعتبار سے قرآن کی تمام آئتیں ایک جیسی ھیں اور کیا قرآن میں سرے سے کوئی ایسی آیت ھے ھی نھیں جس کے لئے کسی معصوم مفسر کی ضرورت ھو؟ یہ دعویٰ وھی کرسکتا ھے جو قرآن سے زیادہ لگاؤ نھیں رکھتا اور اس کی روح و فکر قرآن سے ھم آھنگ نھیں ھے۔ صحیح ھے کہ قرآن کی بھت سی آیتیں دلالت کے اعتبار سے روشن و واضح ھیں اور اس کی محکم آیات میں شمار ھوتی ھیں اور وہ قرآنی آیات بھی جو مبھم ھیں دوسری آیتوں کے ذریعہ روشن و واضح ھو جاتی ھیں۔ (16) اس کے باوجود قرآن میں ایسی آیتیں موجود ھیں جو یا نزول کے وقت سے ھی مبھم ھیں یا زمانۂ وحی سے دوری کی وجہ سے مبھم ھوگئی ھیں۔ اس

قسم کی آیات چاہے ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو کیسے حل کی جاسکتی ہیں؟

کیا امت کے درمیان کوئی ایسی مرکزی شخصیت موجود نہیں ہونی چاہئے جو اس قسم کی آیات کا ابہام دور کر کے ان کی صحیح تفسیر کر سکے جن میں سے بعض کے نمونے آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں؟

حضرت علی علیہ السلام نے جب ابن عباس کو خوارج سے مناظرہ کے لئے روانہ کیا تو انھیں یہ حکم دیا تھا کہ: "لاتخاصمھم بالقرآن فان القرآن حمال ذو وجوہ تقول و یقولون" یعنی ان سے ہرگز قرآن سے بحث و مباحثہ نہ کرنا، کیوں کہ قرآن کی آیاتیں کئی احتمالات اور کئی معانی رکھتی ہیں۔ تم ان سے بعض آیات سے استدلال کروگے اور وہ تمھیں بعض دوسری آیات سے جواب دیں گے۔

یہ مسلم ہے کہ امام کی یہ گفتگو قرآن کی تمام آیات سے متعلق نہیں تھی بلکہ آپ کی گفتگو ان آیات سے متعلق تھی جو دو پہلو والی ہیں، بظاہر روشن و واضح نہیں ہیں اور ان کا مفھوم و مفاد قطعی نہیں ہے۔

اس اعتبار سے امت کے درمیان ایک امام معصوم کا وجود جو اسلام کے اصول و فروع سے پوری طرح آگاہ ہو، قرآن کریم کے علوم پر کامل تسلط رکھتا ہو اور امت کے درمیان ایک علمی و فکری پناہگاہ ہو۔ اختلافات دور کرے اور اس کی بات فیصلہ کن ہو، لازم و ضروری ہے ورنہ دوسری صورت میں اختلافات بڑھتے جائیں گے بلکہ بعض احکام اور قرآنی آیات کی تفسیر غلط کی جائے گی جو مسلمانوں کے قرآنی حقائق سے دور ہوجانے کا باعث ہوگی۔

هشام ابن حکم

هشام، امام جعفر صادقؑ کے زبردست شاگرد اور دوسری صدی ہجری میں علم مناظرہ اور علم کلام کے استاد تھے انھوں نے امت کے درمیان اختلاف دور کرنے اور صحیح فیصلہ کے لئے امام کے وجود کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے کہ آپ نے ایک روز فرقہ معتزلہ کے سردار اور بصرہ کے پیشوا عمرو بن عبید سے امت کے درمیان امام معصوم کے وجود کی ضرورت پر بحث کی شروع اور اس سے درخواست کی کہ میرے سوالوں کے جواب دو۔ عمرو بن عبید نے بھی قبول کیا۔ هشام نے پوچھا:

تمھارے آنکھ ہے؟

ہاں

اس سے کیا کام لیتے ہو؟

اس سے لوگوں اور چیزوں کو دیکھتا ہوں اور رنگوں کی تشخیص دیتا ہوں۔

تمھارے کان ہے؟

ہاں؟

اس سے کیا کام لیتے ہو؟

اس سے آواز سنتا ہوں۔

تمھارے ناک ہے؟

هاں۔
اس سے کیا کام لیتے هو؟
اس سے بوسونگھتا هوں۔

اس کے بعد هشام نے دوسرے حواس یعنی قوت ذائقہ ولامسہ اور بدن کے دوسرے اعضاء مثلاانسان کے جسم میں هاتھ اور پاؤں وغیرہ کے بارے میں سوال کیااورعمرو بن عبید نے ان سب کا صحیح جواب دیا۔ پھر هشام نے پوچھا: تمھارے دل هے؟ هاں۔ انسان کے بدن میں اس کا کیا کام هے؟ عمرو نے جواب دیا کہ جو کچھ بدن کے تمام اعضاء و جوارح انجام دیتے هیں قلب کے ذریعہ انھیں تشخیص دیتا هوں۔ اور جب بھی انسانی حواس میں سے کوئی خطا کرتا هے یا بدن کا کوئی حصہ شک میں مبتلا هوتا هے تو قلب ودل کی طرف رجوع کرتا هے اور اپنے شک کو دور کر دیتا هے۔

اس وقت هشام نے اس بحث سے نتیجہ حاصل کرتے هوئے کها کہ جس خدا نے جسم کے حواس اوراعضاء کی شک وتردید دور کرنے کے لئے بدن میں ایک ایسی پناهگاه اور مرکزی چیز پیدا کی هے کیا یہ ممکن هے کہ انسانی معاشرہ کو یوں هی اس کے حال پر چھوڑ دے اوراس کے لئے کوئی پیشوا ورهبر معین نہ کرے کہ انسانی معاشرہ اپنے شک، حیرانی اور خطا کو اس کے ذریعہ دور کرے اور صحیح راہ اختیار کر سکے! (17)

امام جعفر صادق (ع)، جانشین پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مرتبہ اوراس کی حیثیت کو یوں بیان فرماتے هیں: پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد ایسے امام کا

وجود لازم وضروری ھے جو الٰھی احکام کو ھر طرح کی گزند اور کمی وزیادتی سے محفوظ رکھے اور ان کی حفاظت کرے ۔ (۱۸) ھشام ابن حکم نے ایک روز حضرت امام جعفر صادق ں کی موجودگی میں شام کے ایک عالم سے مناظرہ کیا اور اس تفصیلی مناظرہ کے دوران اس سے پوچھا کہ کیا خداوند عالم نے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے درمیان ھر طرح کے اختلافات دور کرنے کے لئے کوئی دلیل و حجت ان کے حوالے کی ھے؟اس نے کھا: ھاں اور وہ دلیل و حجت قرآن کریم اور پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت یعنی ان کی احادیث ھیں ۔ھشام نے پوچھا: کیا قرآن واحادیث اختلافات دور کرنے کے لئے کافی ھیں ۔اس نے جواب دیا ھاں ۔تو ھشام نے کھا اگر کافی ھیں تو پھر ھم دونوں جو ایک مذھب رکھتے ھیں اور ایک ھی درخت کی شاخیں ھیں آپس میں اختلاف کیوں رکھتے ھیں؟ اور ھم میں سے ھر ایک نے ایسی راہ کیوں اختیار کر رکھی ھے جو دوسرے کے خلاف ھے؟! اس پر اس شامی عالم کو خاموشی اختیار کرنے اور حقانیت کا اعتراف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا ۔(19)

چھٹی فصل

خطرناک مثلث

اسلام کے تین دشمن

جس وقت پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دنیا سے رحلت فرمائی تو اسلام کے اس نوجوان وجود کو باھر اور اندر سے تین طرح کے دشمن گھیرے ھوئے تھے اور ھر لحہ اس کو خطرہ تھا کہ یہ تینوں طاقتیں باھم ایک ھو کر ایک مثلث بنائیں اور اسلام پر حملہ آور ھوں۔

پھلا دشمن:

داخلی دشمن یعنی مدینہ اور اس کے آس پاس کے منافقین تھے جنھوں نے کئی بار پیغمبر اکرم کی جان لینے کی کوشش کی تھیں اور جنگ تبوک سے واپسی کے وقت ایک خاص منصوبہ کے تحت جو پورے طور سے تاریخ میں ذکر ھوا ھے، پیغمبر کرم کے اونٹ کو بھڑکا کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان لینا چاھتے تھے۔

پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان لوگوں کی سازش سے آگاہ ھو کر وہ تدبیر اپنائی کہ ان کا منصوبہ ناکام ھو گیا۔ ساتھ ھی اسلام کی عمومی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ھوئے آنحضرت نے اپنی زندگی میں ھی ان کے نام بعض خاص افراد مثلاً ”حذیفہ یمانی“ کو بتا دیئے تھے۔

اسلام کے یہ دشمن جو بظاھر مسلمانوں کے لباس میں چھپے ھوئے تھے، آنحضرت کی موت کا انتظار کر رھے تھے اور در حقیقت اس آیت کو اپنے دل میں دھرا رھے تھے جسے قرآن پیغمبر کی حیات میں کافروں کی زبانی نقل کرتا ھے: ”انما نتربص بہ ریب المنون“ (20) یعنی ھم اس کی موت کا انتظار کر رھے ھیں کہ وہ فوت ھو جائے اور اس کی شھرت ختم ھو جائے۔

یہ لوگ یہ سوچ رھے تھے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے ساتھ ھی اسلام کی رونق ختم ھوجائے گی،اس کا پھیلاؤ رک جائے گا۔ کچہ لوگ یہ بھی سوچتے تھے کہ اسلام آنحضرت کے بعد کمزور پڑ جائے گا اور وہ دوبارہ زمانۂ جاھلیت کے عقائد کی طرف پلٹ جائے ں گے۔

آنحضرت کی رحلت کے بعد "ابوسفیان" نے چاھا کہ قریش اور بنی ھاشم کے درمیان اختلاف پیدا کردے اور جنگ بھڑکا کر اسلامی اتحاد کے اوپر کاری ضرب لگائے اس مقصد کے پیش نظر وہ بڑے ھمدردانہ انداز میں حضرت علی علیہ السلام کے گھر میں داخل ھوا اور ان سے بولا: اپنا ھاتھ بڑھایئے کہ میں آپ کی بیعت کروں تاکہ تمیم اور عدی قبیلوں کے لوگ آپ کی مخالفت کی جرأت نہ کریں※ امام نے پوری ھوشیاری کے ساتھ صف اسلام میں اختلاف پیدا کرنے اور مسلمانوں کو آپس میں ٹکرانے کی اس کی شازش کو سمجہ لیا لھذا فوراً ٹکا سا جواب دیا اور خود پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تجھیز وتکفین میں مشغول ھو گئے۔(21)

مسجد ضرار جو نویں ھجری میں بنائی گئی تھی اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے عمار یاسر کے ھاتھوں منھدم کی گئی تھی پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات کے آخری دنوں میں منافقوں کی خفیہ سازشوں کا ایک نمونہ تھی اور دشمن خدا (ابن عامر) سے ان کے تعلقات کو ظاھر کرتی تھی ابن عامر وہ شخص ھے جو فتح مکہ کے بعد روم بھاگ گیا اور وھاں سے اپنے گروہ کی ھدایت ورھنمائی کیا کرتا تھا۔ ھجرت کے نویں سال جب پیغمبر اکرم (صلی

اللہ علیہ و آلہ وسلم) جنگ تبوک پر جانے کے لئے مدینہ سے نکلے تو داخلی سطح پر منافقوں کے ممکنہ فساد و سازش کے خطرہ سے بھت زیادہ پریشان تھے۔اسی لئے آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور آپ کے لئے وہ تاریخی جملہ فرمایا تھا" انت منی بمنزلة ھارون من موسیٰ" (22) یعنی اے علی (ع) تم کو مجہ سے وھی نسبت ھے جو ھارون کو موسیٰ (ع) سے تھی۔اس کے بعد آپ نے ان سے تاکید کی کہ داخلی سطح پر مدینہ میں سکون و آرام برقرار رکھنے اور فتنہ وفسد کی روک تھام کے لئے مدینہ میں ھی رھو۔

منافقوں اور ان کی خطرناک سازشوں سے متعلق بھت سی آیتیں قرآن کریم کے مختلف سوروں میں موجود ھیں اور سب کی سب اسلام سے ان کی دیرینہ عداوت کو بیان کرتی ھیں ۔اورابھی یہ فسادی مدینہ میں موجود ھی تھے کہ آنحضرت نے دنیا سے رحلت فرمائی۔

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی رحلت کے بعد قبائل عرب میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو آپ کے بعد کفر وشرک کی طرف پلٹ گئے اور ماموران زکوٰة کو باھر نکال کر انھوں نے اسلام کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔یہ لوگ اگرچہ منافق نھیں تھے،لیکن ایمان کے اعتبار سے اتنے کمزور تھے جو پت جھڑ کے پتوں کی طرح ھر رخ کی ھوا پر ادھرادھر ھی اڑنے لگتے تھے ۔اگرانھیں کفروشرک کا ماحول مناسب لگتا تو اسلام کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کر لیتے تھے۔

ایسے خونخوار دشمنوں کے ھوتے ھوئے جو اسلام کی کمین میں بیٹھے تھے اور اسلام کے خلاف سازش وشورش میں مشغول تھے کیا یہ ممکن تھا کہ ایسے عاقل،سمجھدار اور دور اندیش پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ان ناگوار حوادث کی روک تھام کے لئے اپنا کوئی جانشین مقرر نہ

کریں اور امت و اسلام کو دشمنوں کے درمیان اس طرح حیران و سرگردان چھوڑ جائیں کہ ھر گروہ یہ کھتا نظر آئے کہ " منا امیر منا امیر " یعنی یہ کھے کہ امیر ھم میں سے ھونا چاھئے اور وہ کھے کہ امیر ھم میں سے ھونا چاھئے ؟!

باقی دو دشمن

اس مثلث کے بقیہ دو دشمن اس وقت کی ایران و روم کی دو بڑی طاقتیں تھیں ۔ روم کی فوج سے اسلام کی پھلی جنگ ھجرت کے آٹھویں سال فلسطین میں ھوئی جو لشکر اسلام کے بڑے بڑے سرداروں " جعفر طیار "، " زید بن حارث " اور " عبداللہ بن رواحہ " کے قتل اور لشکر اسلام کی انتھائی سخت شکست پر تمام ھوئی اور لشکر اسلام خالد بن ولید کی سرداری میں مدینہ واپس آیا ۔ کفر کی فوج سے لشکر اسلام کی اتنی سخت شکست سے قیصر روم کے حوصلے بلند تھے اور ھر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ کھیں وہ لوگ مرکز اسلام پر حملہ نہ کریں اسی وجہ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ھجرت کے نویں سال ایک بڑا لشکر جس کی تعداد تیس ھزار تھی لیکر شام کی طرف روانہ ھوئے تا کہ فوجی مشق کے علاوہ دشمن کے ممکنہ حملہ کو روک سکیں اور راہ کے بعض قبائل سے تعاون یا غیر جانبداری کا عھد و پیمان لے سکیں ۔ اس سفر میں جس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مسلسل رنج و زحمت اٹھانا پڑی آپ رومیوں سے لڑے بغیر مدینہ واپس آ گئے ۔

اس کامیابی نے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مطمئن نھیں کیا آپ لشکر اسلام کی

شکست کے جبران کی کوشش میں لگے رھے۔اس کے لئے آپ نے اپنی بیماری سے چندروز پھلے"اسامہ بن زید" کولشکر اسلام کا علم دے کر اپنے ساتھیوں کوحکم دیا کہ اسامہ کی سرداری میں شام کی طرف روانہ ھوں اوراس سے پھلے کہ دشمن ان پرحملہ کرے وہ جنگ کے لئے تیار رھیں۔

یہ تمام واقعات اس بات کی حکایت کرتے ھیں کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شمال یعنی روم کی طرف سے بھت نگراں تھےاور کھا کرتے تھے کہ ممکن ھے قیصر روم کی طرف سے اسلام کوسخت حملہ کا سامنا کرنا پڑے۔

تیسرا دشمن ایران کی ساسانی شھنشاھی تھی۔یھاں تک کہ خسرو پرویز نے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خط پھاڑ ڈالا تھا،سفیر کوقتل کردیا تھااور یمن کے گونر کولکھا تھا کہ (معاذ اللہ) پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوقتل کر کے ان کا سر میرے پاس مدائن روانہ کرے۔

حجاز اور یمن عرصہ سے حکومت ایران کا حصہ شمار ھوتے تھے لیکن اسلام کے آنے کے بعد حجاج نہ صرف آزاد ھوگیا تھا بلکہ خودمختار ھوگیا تھااور یہ امکانات بھی پیدا ھوگئے تھے کہ یہ محروم اور کچلی ھوئی قوم اسلام کے سایہ میں پورے ایران پر مسلط ھوجائے۔

اگر چہ خسرو پرویز پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی حیات میں گزر گیا تھا لیکن ساسانیوں کی حکومت سے یمن اور حجاز کا جدا ھوجانا ان لوگوں کے لئے اتنا بڑا دھکا تھا جوخسرو کے جانشینوں کے ذھن سے دور نھیں ھوا تھا۔ساتھ ھی یہ بڑھتی ھوئی نئی طاقت جو ایمان و اخلاص اورفداکاری سے آراستہ تھی ان کے لئے نا قابل برداشت تھی۔

ایسے طاقتور دشمنوں کے ھوتے ھوئے کیا یہ درست تھا کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس دنیا سے چلے جائیں اور امت اسلام کے لئے اپنا کوئی فکری و سیاسی جانشین معین نہ کریں؟ ظاھر ھے کہ عقل، ضمیر اور سماجی محاسبات ھرگز اس کی اجازت نھیں دیتے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس طرح کی بھول ھوئی ھوگی۔ اور انھوں نے ان تمام حادثات و مسائل کو نادیدہ قرار دیتے ھوئے اسلام کے گرد کوئی دفاعی حصار نہ بنایا ھوگا اور اپنے بعد کے لئے ایک آگاہ، مدیر و مدبر اور جھاندیدہ رھبر معین نہ کیا ھوگا۔

ساتویں فصل

روحی و معنوی کمال

معصوم امام کے سایہ میں

اس دنیا میں ھر وجود ایک مقصد کے تحت خلق ھوا ھے اور اس وجود کی غرض خلقت اور کمال اسی وقت حاصل ھوتا ھے جب اس تخلیق کا مقصد پورا ھو جائے۔قدرت بھی موجودات کو کمال تک پھنچانے کے لئے ھر وہ وسیلہ اس کے حوالے کرتی ھے جو اسے کمال تک پھنچانے میں موثر ھوتا ھے۔اس راہ میں وہ صرف ضروری وسائل پر اکتفا نھیں کرتی بلکہ ھر جزئی اور غیر ضروری وسائل بھی اسے عطا کرتی ھے۔خوش قسمتی سے اس بارہ میں عالم طبیعت سے متعلق علوم (NATURAL SCIENCES) نے ھمارے زمانہ میں اپنی وسعت کے پیش نظر ھمیں ھر طرح کی مثال اور وضاحت سے بے نیاز کر دیا ھے۔

اگر ھم صرف انسانی جسم میں سننے اور دیکھنے کے حیرت انگیز وسائل پر غور کریں تو ان میں سے ھر ایک یہ پکار پکار کر کھتا نظر آئے گا کہ نظام خلقت نے ھر وجود کو اس کے کمال ---جس کے لئے وہ خلق کیا گیا ھے---تک پھنچانے پر خاص توجہ دے رکھی ھے۔

اب ذرا ھم جسم کے دوسرے حصوں کے بارے میں غور کریں جن کی طرف سے زیادہ تر غفلت برتی گئی ھے اور اھمیت کے اعتبار سے اسے دوسروں پر ثانوی حیثیت دی گئی ھے۔ !مثال کے طور پر ھم انسان کے تلووٴں کی ساخت اور ان کے خاص انداز کے گڑھوں پر غور کریں۔ان کو خدا نے اس غرض سے بنایا ھے کہ انسان کو چلنے میں آسانی ھو۔حتیٰ جن کے پاؤں کے تلوے پیدائشی طور سے بالکل ھموار ھوں وہ آپریشن کے ذریعہ تلووٴں میں گڑھے بنواتے ھیں تاکہ آسانی سے چل سکیں۔

هماری انگلیاں لمبائی اور موٹائی کے لحاظ سے باهم فرق رکھتی هیں کیوں کہ اگروہ سب یکساں هوتیں تو انسان ان سے جو بهت سے مختلف کام کرتا هے نهیں کر پاتا۔ انگلیوں کے اس اختلاف هی کی وجہ سے انسان ظریف اور باریک صنعتوں اور بهترین هنر اورفنون کا خالق بنا هے۔اس کی هتھیلیوں اور انگلیوں میں ایسے خطوط اور لائینیں هیں جو هر چھوٹی اور بڑی چیز کے اٹھانے یا پکڑنے میں اس کی مدد کرتی هیں ،اور چوں کہ هرانسان کی انگلیوں کے خطوط ایک دوسرے سے جدا هیں لهذا هر فرد کی شناخت کے لئے اس کی انگلیوں کےنشانات لئے جاتے هیں۔

یہ اوران جیسی دوسری مثالوں سے هم یہ نتیجہ لیتے هیں کہ دست قدرت نے هر طرح کے وسیلہ کو خواہ اس کے لئے ضروری هو یا غیر ضروری جوبھی اس کے کمال کے لئے موثر هے اس کے اختیار میں دیا هےاوراس راہ میں اس کے لئے انتهائی سخاوت مندی کا مظاهرہ کیا هے۔

اب یہ سوال پیش آتا هے کہ جوخدااس حدتک انسان کی سعادت وکمال کا خواهاں هے،آخر یہ کیسے ممکن هے وہ اس کے معنوی وروحانی کمال سےچشم پوشی کرلے؟!

یہ بیان جس طرح خداوند عالم کی جانب سے انبیاء ومرسلین کی بعثت کی ضرورت کوثابت کرتا هے،اسی طرح تمام معارف واحکام کے اسرار سے آگاہ امام معصوم کےتعین کوبھی لازمی قرار دیتا هے۔ کیونکہ وحی الٰهی کی جانب سے ایک ایسے امام کاتعین اسلامی معاشرہ میں بهت سی کشمکشوں ،جنگوں ،نفاق اور معاشرہ کی پسماندگی کے خاتمہ کا سبب بنتا هےاور مسلمانوں کو ایک جماعت اور ایک گروہ کی مشکل میں تبدیل کردیتا هےاور هر طرح کے اختلاف وتفرقہ

سے جو رھبر وخلیفہ کے انتخاب کا لازمہ ھے نجات دے دیتا ھے۔ نتیجہ میں مسلمانوں کو" سقیفہ بنی ساعدہ" اوردوسری پراسرار شوراؤں کا سامنا نھیں کرنا پڑتا۔

مسلمان پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد الٰھی نص (خدا کی طرف سے کی جانے والی تعیین) سے چشم پوشی کر کے یا (جیسا کہ علمائے اھل سنت تصور کرتے ھیں) اللہ کی جانب سے نص نہ ھونے کی صورت میں۔ اس قدر اختلاف وتفرقہ کا شکار ھوئے کہ اس کے منحوس آثار چودہ صدیوں کے بعد بھی دور نھیں ھوئے۔ اور آج بھی استعماری طاقتیں جو مسلمانوں کو متحد دیکھنا نھیں چاھتیں مسلمانوں میں اختلاف برقرار رکھنے کے لئے آگ میں تیل ڈالنے کا کام کرتی رھتی ھیں۔

لیکن اگر مسلمان معاشرہ کا رھبر خدا کی جانب سے معین ھو اور مسلمان اپنے ناپختہ اور خام خیالات کو الٰھی نص وھدایت پر مقدم نہ کریں تو مسلّم طور سے مسلمانوں کی حالت ھر زمانہ میں اس سے کھیں بھتر ھو۔ اس کے علاوہ ھر طرح کے گناہ، خطا اور اشتباہ سے محفوظ اور شریعت کے معارف واحکام کے اسرار سے آگاہ امام معصوم کا وجود انسانی معاشرہ اور افراد کی روحانی ترقی اور کمال کی راہ میں ایک بڑا قدم ھے۔ پھر کیا یہ کھا جا سکتا ھے کہ ایسے رھبر کا وجود کیا انگلیوں اور ھتھلیوں کی لائینوں، پیروں کے تلوؤں کی گھرائیوں اور آنکھوں کے اوپر ابرو کے جتنا بھی اھمیت نھیں رکھتا ھے؟!

اس صورت میں کیا یہ کھا جا سکتا ھے کہ خداوند عالم نے انسان کے جسمانی کمال کے لئے تو ھر طرح کے وسائل اس کے اختیار میں دے دیئے لیکن معنوی کمال کے وسائل سے، جو اس کی

روح کی ترقی میں موثر کردار ادا کرتے هیں، اسے محروم کر دیا هے۔

شیخ الرئیس ابن سینا نے کتاب "شفا" کی نبوت کی بحث میں مذکورہ بالا بیان سے انبیاء کی بعثت کی ضرورت کو ثابت کیا هے۔(23) لیکن جیسا کہ هم عرض کر چکے هیں یہ بیان جس طرح انبیاء و

مرسلین کی بعثت کی ضرورت کو ثابت کرتا هے اسی طرح ایک معصوم اور شریعت کے اسرار سے آگاہ امام کی تعیین کو بھی پوری طرح ثابت کرتا هے، جو انسانوں کے روحی کمال کا ذریعہ هے۔

آٹھویں فصل

کیا شیعوں کا نظریۂ امامت آزادی کے خلاف هے

حریت و آزادی کا لفظ انسانوں کے کانوں میں پڑنے والا اب تک کا سب سے لطیف اور پر جوش لفظ ھے۔ اس لفظ کا سنناھی لوگوں کے اندر کیف ونشاط، وجد وخوشی کی لھر پیدا کر دیتا ھے۔ ایک صحیح فکر رکھنے والے انسان کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا قید و بند سے نجات ،استعمار سے جھاد اور آزادی کی بلند بام چوٹی کو فتح کرنا ھے۔ آزادی سے متعلق انسان کا لگاؤ اتنا زیادہ ھے کہ اس نے اس راہ میں بھت سی قربانیاں دی ھیں اور حد سے زیادہ فداکاریاں کی ھیں۔

یہ درست ھے کہ انسان نے یہ بخوبی محسوس کرلیا ھے کہ اجتماعی زندگی ایک ایسے حاکم کے بغیر ممکن نھیں ھے جس کی رائے نافذ اور جس کا فیصلہ قطعی۔ لیکن ساتھ ھی وہ اس پر بھی ھرگز آمادہ نھیں ھے کہ اپنے مقدرات کسی ایسے شخص کے ھاتھ میں دے دے جس کے انتخاب کا اختیار اس کے ھاتھ میں نہ ھو۔ یھی وجہ ھے کہ خاص طور سے عصر حاضر میں معاشرہ کے حاکم وذمہ دار کے تعین کے طریقوں میں وہ صرف اسی روش کو صحیح جانتا ھے، جس میں وہ اپنے رھبر کے انتخاب میں خود مختار اور آزاد ھو۔ جو حاکم ایک قوم کی سرنوشت کو اپنے ھاتھ میں لیتا ھے وہ خود عوام سے ابھرے اور عوام نے اسے منتخب کیا ھو۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ ایک فرد کی حکومت کو اصول آزاد کے خلاف اور جبر کی حاکمیت سمجھتا ھے۔

اب دیکھنا یہ ھے کہ امامت کے سلسلہ میں پائے جانے والے دو نظریوں میں کون سا نظریہ ڈیموکریسی کے اصول سے زیادہ سازگار ھے، یہ کہ منصب امامت ایک انتخابی منصب ھے یعنی امام کو "عام لوگوں کے ذریعہ یا اسلام کی اعلیٰ کمیٹی" کے ھوتھوں چنا جانا چاھئے۔ یا یہ کہ رھبر

اور جانشین پیغمبر کا انتخاب عوام کے ھاتھ میں نہ ھو بلکہ وہ سو فیصدی خدا کی جانب سے منصوب ھو یعنی امام کو خدا اور پیغمبر کی جانب سے معین ھونا چاھئے؟

بعض لوگوں کا خیال ھے کہ پھلا نظریہ آزادی کے اصول سے زیادہ ھم آھنگ ھے۔ اگر ھم رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانشینی کے منصب کو انتخابی سمجھیں تو اس صورت میں ھمیں یہ فخر کرنا چاھئے کہ لیبر لیزم اور آزادی مغرب میں پروان چڑھنے سے پھلے مشرق میں اور ایک ھزار چار سو سال پھلے قابل عمل تھی۔ لیکن اس راہ سے ھم اس جگہ پھنچتے ھیں جھاں پھلے نظریہ پر عمل ھی نھیں ھوا۔

آج اھل سنت معاشرہ کے بعض اھل قلم شیعہ نظریہ یعنی امامت کے انتصابی ھونے کے موضوع پر تنقید کرتے ھیں اور کھتے ھیں کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانشینی کا نصی ھونا آج کے سماجی نظریات اور آزادی کی روح سے کسی بھی طرح سازگار نھیں ھے۔

جواب: شاید جو سب سے اھم اور دلچسپ منطق امام کے انتخابی ھونے کے سلسلہ میں پیش کی جاسکتی ھے اور جسے آج کے انسانی معاشرہ کے خیالات سے قریب قرار دیا جاسکتا ھے، وھی منطق ھے جسے ھم اوپر بیان کر چکے ھیں اور جو کم وبیش بعض علمائے اھل سنت کے قلم سے بھی ظاھر ھو چکی ھے۔ اس طرز استدلال کا تفصیلی جواب اس پر منحصر ھے کہ موجودہ بحث کے تین اساسی نکتے پوری طرح واضح ھوں:

1۔ منصب امامت کا نصی یا منصوبی ھونا "استبداد" اور جبر سے بالکل جدا ھے۔

2۔ مغرب کی جمھوری حکومتیں جو اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی اساس پر استوار ھیں۔ وہ

ان غیر عادلانہ سیاسی نظاموں میں سے ھیں جنھیں آج کے انسانوں نے مجبوراً قبول کیا ھے۔
3۔اگر یہ فرض کرلیں کہ حاکم کے انتخاب کے لئے یھی روش صحیح و درست ھے تو کیا صدر اسلام میں خلفاء کے انتخاب میں اس روش پر عمل ھوا ھے؟
ان تین نکتوں خاص طور سے دوسرے اور تیسرے نکتہ پر مفصل بحث کی ضرورت ھے کہ ھم اختصار کے ساتھ ان میں سے ھر ایک پر روشنی ڈالتے ھیں۔

الف)۔امام کا منصوب کیا جانا استبداد نھیں

استبدادی حکومتیں وہ انتھائی ظالمانہ طریقۂ حکومت ھے جن سے انسان دو چار رھا ھے۔ استبدادی نظام جبر و تشدد کا وہ جانکاہ نظام ھے جنھیں انسانی معاشرہ زمانہ قدیم سے جھیلتا آرھا ھے اور انسان کی معاشرتی زندگی میں اس کی مختلف شکلیں (گاؤں کا زمیندار، تعلقدار، قبیلہ کا سردار، یا مطلق العنان حاکم جو زمین کے وسیع علاقہ پر خودسرانہ حکومت کرتا ھے) نظر آتی رھی ھیں۔
استبداد کی بڑی شکل یہ کہ ایک شخص داخلی سطح پر بغاوت کے ذریعہ حاکم کو معزول کرکے خود حاکم ھو جاتا ھے یا غلبہ اور دوسرے ملک کی فوجی طاقت کے ذریعہ حاکم ھو جاتا ھے اور ایسی حکومت کی بنیاد ڈالتا ھے جس میں صرف حاکم کی بات یا اس کا حکم ھی نافذ ھوتا ھے اور اپنے بعد کے حاکم کے لئے بھی اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ھوتا ھے۔
پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانشینی کے سلسلہ میں شیعوں کا نظریہ اس طرح کی

حکومتوں سے میلوں کا فاصلہ رکھتا ھے۔امام کے منصوبی ھونے سے شیعوں کا مقصد یہ ھے کہ امام خدا کی جانب سے۔۔۔جو سب کا خالق ھونے کے اعتبار سے تمام انسانوں پر اولویت اورحاکمیت کا حق رکھتا ھے۔۔ایک سب سے زیادہ شائستہ فرد کی حیثیت سے جو ھر طرح کی جسمی وروحی آلودگی، برائی اورلغزش سے پاک ھے اورصرف اللہ کے حکم پر عمل کرتا ھے، پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد مسلمانوں کا رھبر وپیشوا معین کیا جائے۔

یہ کھنے کی ضرورت نھیں ھے کہ ایسا شخص اپنے منصب پر فائز ھونے کے بعد ھر طرح کی خودسری وخودرائی سے دور ھوگا اورصرف پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لائے ھوئے قوانین کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کو چلائے گا۔

چونکہ خداوند عالم خالق ھونے کی بنا پر فطری طور سے سب پر حکومت کا حق رکھتا ھے اورتمام قوموں نے اس کے قوانین کو جان ودل سے تسلیم کیا ھے لھذا امام بھی ان ھی قوانین کی بنیاد پر حاکم ھوا ھے اورمعصوم ھونے کی بنا پر ھر طرح کے عمدی سھوی ظلم وستم سے محفوظ ھے، ایسی حکومت معقول ترین حکومت ھے ۔اس طرح کی حکومت میں اقلیت و اکثریت (یعنی اکثریت کی ڈکٹیٹر شپ) کا تصور ھی نھیں ھے ۔اس میں صرف خدا کی رضااورمخلوق کی مصلحت ھی پیش نظر ھوتی ھے (کوئی شخصی مرضی نھیں تھوپی جاتی اورنہ ان افراد کی خوشی مدنظر ھوتی ھے جنھوں نے اسے حاکم بنایا ھے)۔

یہ الٰھی وآسمانی حکومت جس میں کسی بھی طرح کی خودسری اورخودخواھی نھیں ھے بھلا اس کا ان ظالم واستبدادی حکومتوں سے کیا تقابل ۔یہ دونوں طرز حکومت ایک دوسرے سے اس قدر

فاصلہ رکھتی ھیں کہ ان میں کسی بھی مشترک پھلو کا تصور کیا ھی نھیں جا سکتا۔

(ب)۔جمھوری حکومتوں کی کمزوریاں

آج کی جمھوری حکومتوں کی کمزوریاں ایک دو نھیں ھیں کہ یھاں ان پر تفصیل سے بحث کی جائے لیکن ھم یھاں نمونہ کے طور پر ان ھیں سے دو اھم کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ھیں۔

1۔اس طریقۂ حکومت میں جو حاکم کسی پارٹی یا عوام کی ھاتھوں منتخب ھوتا ھے وہ ان کی رضامندی وخوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رھتا ھے۔ان کی ھدایت ورھبری کی فکر میں نھیں رھتا۔کسی پارٹی یا گروہ کے سیاستداں کے لئے یہ اھم نھیں ھے کہ وہ حق کا ساتھ دے ،اھم یہ ھے عوام کی حمایت سے اسے ھاتھ نہ دھونا پڑے۔اس کام میں کبھی اس کے لئے لازم وضروری ھوجاتا ھے کہ اپنے ذاتی اعتقادات اور حقائق سے بھی آنکھیں بند کرلے۔یہ وہ حقیقت ھے جس کا اظھار واقرار دنیا کے ان عظیم سیاستدانوں نے بھی کیا جو عرصہ تک پوری دنیا کی سیاست سے کھیلتے رھے ھیں امریکہ کا ایک گزشتہ صدر جان۔ایف کنیڈی اپنی کتاب میں لکھتا ھے:

کبھی سینیٹر مجبور ھوتا ھے کہ کسی اھم موضوع کے سلسلہ میں عام جلسہ میں فوراً ھی اپنی رائے اور نظریہ کا اظھار کرے۔اس میں شک نھیں ھے کہ وہ بھی غور وفکر کرنے کے لئے وقت چاھتا ھے تا کہ چند جملوں میں یا مختصر اصلاح کے ذریعہ شبھہ واختلاف کو بقدر امکان دور

کرے، لیکن نہ اسے غور کرنے کا موقع ملتا ھے نہ وہ خود کو لوگوں سے چھپا سکتا ھے اور نہ ھی اپنی رائے کے اظھار سے گریز کر سکتا ھے۔ بالکل ایسا لگتا ھے جیسے تمام موکل جنھوں نے اسے سنیٹر بنایا ھے اس کی طرف آنکھیں گاڑے ھوئے اس بات کے منتظر ھیں کہ اس شخص کی رائے، جس سے اس کی سیاست کا مستقبل وابستہ ھے، کیا ھوگی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اس بات کی فکر کہ سنیٹر کی مراعات اس سے سلب نہ کر لی جائےں اور کھیں وہ اس چرب و نرم مشغلہ سے محروم نہ کر دیا جائے بڑے سے بڑے سیاستداں کی نیندیں حرام کئے رکھتی ھے۔

یھی وجہ ھے کہ بعض سنیٹر اس نکتہ کی طرف متوجہ ھوئے بغیر آسان اور کم خطرہ راہ اختیار کرتے ھیں۔ یعنی جب بھی ان کے ضمیر اور ان کے فیصلوں کے درمیان ٹکراو ھوتا ھے تو اپنی خود ساختہ منطق کے ذریعہ ضمیر کو مطمئن کر دیتے ھیں اور خود کو اپنے ووٹروں کے خیالات سے ھم آھنگ کر دیتے ھیں ایسے لوگوں کو ڈرپوک نھیں کھا جا سکتا بلکہ یہ کھنا چاھئے کہ یہ وہ لوگ ھیں جنھیں رفتہ رفتہ عام لوگوں کے رجحان و خیالات کی پیروی کرنے کی عادت پڑ گئی ھے اور اپنی بھلائی اسی میں دیکھتے ھیں کہ بھتی گنگا میں ھاتھ دھوئیں۔ لیکن ان میں کچہ ایسے لوگ بھی ھیں جو اپنے ضمیر کو کچل ڈالتے ھیں اور اپنے عمل کی توجیہ یوں کرتے ھیں۔ لوگوں میں نفوذ کرنے کے لئے پوری سچائی کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز سے کانوں کو بند کر لیتے ھیں۔

"فرینک کینٹ" کے بقول سیاست کو خلاف اخلاق مشغلہ نھیں کھا جا سکتا بلکہ یہ کھنا چاھئے کہ "سیاست اخلاقی مشغلہ نھیں ھے" (24)

سیاسی رائٹر "فرنیک کنیٹ" لکھتا ھے "کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کا مسئلہ بہت ھی اھم اور سنجیدہ ھے۔اس کے حصول کی راہ میں بلا وجہ کے مسائل مثلاً "اخلاق" یا "حق و باطل" پر کوئی توجہ نھیں کرنا چاھئے۔"

اس سلسلہ میں "مارک اشکال" نے اپنے ایک ساتھی کو 1920ئع کے امریکہ کے انتخابات میں بھترین نصیحت کی اور وہ یہ کہ "تم عوام کو فریب دینا نھیں چاھتے۔یعنی تم نمائندہ بننے کی راہ میں اپنے ضمیر کو کچل نھیں رھے ھو، بلکہ تم یہ بات سیکھو کہ ایک سیاسی آدمی کے لئے ایسے حالات پیش آتے ھیں جن میں وہ اپنے ضمیر سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ھے۔" (25)

یہ آج کی دنیا کے جمھوری لوگوں کی زبان میں سب سے زیادہ منصفانہ باتیں ھیں۔اب آپ اس اجمال سے تفصیل کا اندازہ کرلیں۔یہ آزاد ملکوں کی حکومتوں کی حقیقت ھے۔کیا عقل و منطق اس کی اجازت دیتی ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشین کو جسے بھت سی جھات میں ان ھی کی طرح ھونا چاھئے، اس جمھوری طریقہ پر یعنی عوام کے خیالات کے ذریعہ یا ارباب حل وعقد کی بیعت یا مھاجرین و انصار کی بیعت کے ذریعہ منتخب ھونا چاھئے؟ ھرگز نھیں۔۔۔۔کیوں کہ اس طریقہ سے منتخب ھونے والا شخص فکری طور سے مستقل مزاج نھیں ھوتا بلکہ اپنے ووٹروں کے افکار و خیالات کا ترجمان ھوتا ھے۔ایسے افراد بھت ھی کم اور نادر ھیں جو اپنی شھرت کو ٹھوکر مارنے پر آمادہ ھوجائیں اور عمومی خیالات و رجحان کے طوفان سے نہ ڈریں اور جو بات امت کی بھلائی کے لئے ھو اسی پر عمل کریں۔

ممکن ھے یہ خیال کیا جائے کہ ووٹروں کی رضا مندی کا لحاظ اسی وقت لازم ھے جب حکومت

کی مدت چند سال میں محدود ھو،لیکن چونکہ امام کی رھبری دائمی ھے اور دائمی حاکم کی حیثیت رکھتی ھے جیسا کہ آج بھی بعض ملکوں میں عملی طور پر رائج ھے لھٰذ اضروری نھیں کہ خلافت کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد امام وخلیفہ عوام کی رضامندی وخوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں ھو۔

تو جواب یہ ھے کہ یہ خیال بھت ھی خام اور بیجا ھے، کیوں کہ:

اول تو: خود اس دائمی حاکمیت میں بھی عام انتخاب کرنے والوں کے خیالات ورجحان کو نادیدہ نھیں کیا جاسکتا، کیونکہ بے توجھی کی صورت میں حاکم کو انقلاب ،شورش اور بغاوت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسرے یہ کہ: کئی امیدواروں کی موجودگی میں کسی ایک شخص کا ایک گروہ کی طرف سے منتخب کھا جانا کسی تعاون وھم خیالی کے وعدہ کے بغیر عملی نھیں ھے۔اور اس بات کو دیکھتے ھوئے اگر وہ اپنے کئے ھوئے وعدہ سے چشم پوشی کرلے تو یہ خود ایک بھت بڑی خرابی ھے کیونکہ اس صورت میں معاشرہ کے مربی نے عملا وعدہ خلافی کی ھے اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنا سکھا یا ھے۔

عمر نے اپنی موت کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے جو چہ نفری کمیٹی بنائی تھی اس میں ”عبد الرحمن بن عوف“ نے جس کا جھکاؤ کمیٹی کے دوگروھوں کے درمیان فیصلہ کن تھا،

حضرت علی ں سے کھا: میں آپ کی بیعت کرتا ھوں لیکن اسی شرط پر کہ آپ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت اور شیخین کی سیرت پر عمل کریں گے،حضرت علی ں نے فرمایا: میں صرف خدا کی کتاب ،رسول کی سنت اور اپنی عقل وفکر کی بنیاد پر عمل کروں گا۔اس موقع پر عبد الرحمان بن

عوف نے عثمان سے بھی اسی جملہ کا اقرار لیا اور عثمان نے عبدالرحمان کی شرط پر اپنی وفاداری کا اعلان کیا اور خلیفہ منتخب ھو گئے (اور بعد میں سب نے دیکھا کہ انھوں نے اپنی مرضی سے بنی امیہ کو لوگوں پر مسلط کر دیا۔)

مختصر یہ کہ اکثر لوگوں کا انتخاب کرنے والے ایسی شرطیں رکھتے ھیں جس کا ماننا ایک با ایمان اور با ضمیر شخص کے لئے بڑا ھی سخت اور ناگوار ھوتا ھے۔ظاھر ھے کہ حق شناس ان افراد شرطوں کو تسلیم نھیں کرتے لھذا منتخب بھی نھیں ھوتے اوران کی جگہ غیر صالح افراد ھر طرح کی شرط قبول کر لیتے ھیں اور منتخب ھو جاتے ھیں۔

امریکہ کے صدر کے انتخاب میں آزاد سے آزاد شخص بھی عالمی صھیونزم کی مدد کو اپنے دستور العمل میں اولویت دینے پر مجبور ھوتا ھے اور ووٹ بنانے والی کمیٹیوں سے یہ وعدہ کرتا ھے کہ اگر منتخب ھو گیا تو اسرائیل کی مدد کرے گا۔ چاھے وہ یہ جانتا ھو کہ اس کا یہ عمل عدالت اور انسانیت کے اصول کے سراسر خلاف ھے۔

2۔مغرب کی جمھوری حکومتوں پر دوسرا اعتراض یہ ھے کہ اس جمھوریت کی بازگشت ایک طرح کے ظلم وڈکٹیٹر شپ "تعداد کی ڈکٹیٹر شپ" اور"اکثریت کا اقلیت پر استبداد وظلم) ھے۔ کیونکہ اگر یہ فرض بھی کر لیں کہ انتخابات بالکل صحیح اور کسی چالبازی کے بغیر انجام پائے ھیں اس کے باوجود اکثریت جو صرف ایک ووٹ سے جیتی ھے اس اقلیت پر حکومت کرے گی جو صرف ایک ووٹ سے نھیں جیتی جب کہ ممکن ھے کہ بھت سے موارد میں حق اقلیت کے ساتھ ھو اس کا مطلب یہ ھے صرف ایک ووٹ کے ذریعہ ایک ملک اور قوم کے منافع و مصلحتیں

ضائع ہوجائیں! اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ 49 پر51 افراد کی حکومت ایک طرح کی ظالمانہ حکومت ہے جسے انسان نے مجبوری کی بنا پر اور اس سے بہتر طریقہ نہ ہونے کی صورت میں یا کسی اور راہ کی طرف توجہ دیئے بغیر، جس کی طرف اسلام نے رہنمائی کی ہے، اپنا یا ہے۔

لیکن خدا کی جانب سے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشین کے انتخاب میں جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے ان تمام ناانصافیوں کا سد باب کر دیا گیا ہے۔ امام کو وہ منتخب کرتا ہے جس کے حق حاکمیت پر سب راسخ ایمان رکھتے ہیں اور امام ان قوانین کے مطابق حکومت کرتا ہے جسے تمام لوگ قبول کرتے۔ یہاں پر اقلیت واکثریت کا مسئلہ ہی پیش نہیں آتا۔

ان سب باتوں کے علاوہ جمہوری نظاموں میں اکثریت کی خواہشات اور آرزوئیں قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان کے ارادے قطعی فیصلوں اور محکم حکم کی صورت میں تمام لوگوں پر لاد دیئے جاتے ہیں ،لیکن اسلامی قوانین کی روح ،جس میں ہمیشہ انسانی معاشرہ کی مصلحتوں کو ہی شریعت کا رنگ ملتا ہے، ایسے پست نظریہ کی تائید نہیں کرسکتی۔

قرآن مجید جس نے ہمیشہ لوگوں کے افکار وخیالات کو خطا وغلطی سے آلودہ بتایا ہے اور اکثریت کے بارہ میں فرماتا ہے (واکثرھم لایعقلون) اور (واکثرھم لایشعرون) پھر وہ دین کے سب سے اہم موضوع یعنی امت کی امامت یا قیادت کے انتخاب کے سلسلہ میں معاشرہ کی اکثریت کے رجحان کو کیسے موئثر ونافذ سمجھ سکتا ہے؟ کیا قرآن کریم نے یہ نہیں

فرمایا: (وعسیٰ ان تکرهوا شیئا وهو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وهو شرّ لکم) (26) یعنی بعض اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے هو جب کہ وہ تمهارے لئے مفید و نفع بخش هوتی هے اور بعض اوقات کسی چیز کو تم پسند کرتے هو جب کہ وہ تمهارے لئے مضر و نقصان دہ هے۔ یہ وہ قانون هے جو معاشرہ کی اکثریت کی نفسانی خواهشات کو صراحت کے ساتھ خطا شمار کرتا اور فرماتا هے اکثر لوگوں کے خواهشات ایسی چیز کا تقاضا کرتے هیں جو خطرناک اور نقصان دہ هوتی هے اور کبھی ایسی چیز سے نفرت کا اظهار کرتے هیں جو سو فی صدی ان کے لئے مفید هوتی هے۔ اس روشنی میں امام کے انتخاب یا تعیین کو جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد سب سے اعلیٰ دینی منصب هے، ناقابل اعتبار اکثریت کے حوالے نهیں کیا جا سکتا۔

(ج)۔ کیا صدر اسلام میں خلیفه کا انتخاب اکثریت نے کیا؟

بعض توجیهیں واقعہ کے گزر جانے کے بعد اسباب تراشی کرتی هیں اکثر ایسا هوتا هے کہ ایک معاشرتی واقعہ بعض حالات وشرائط کے تحت وجود میں آتا هے۔ بعد میں آنے والے اس واقعہ کو وجود میں لانے والوں کے فیصلوں کی بنیاد اپنے حدس و گمان پر رکھتے هیں اور اس واقعہ کے لئے بے جهت خوش بینی کی بنا پر ایسے اخلاقی، فکری اور سماجی اسباب وعلل تراشتے هیں کہ واقعہ کو وجود میں لانے والوں کی روح کو ان کی بھی خبر نهیں هوتی۔

اتفاق سے خلفا کی حکومت کے لئے جمهوری نوعیت اور عوام پر عوام کی حکومت یا اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی توجیہ اس کا روشن وواضح مصداق هے در اصل صدر اسلام کے خلفاء

کے انتخاب میں جو چیز وجود میں نھیں آئی وہ عوام کے ذریعہ خلفاء کا انتخاب تھا۔ کیوں کہ نہ اھل سنت کے محقق علماء خلیفہ کے انتخاب میں اس اصل کے معتقد ھیں اور نہ خلفاء کا انتخاب اس طریقہ سے انجام پایا۔ اس کے باوجود عصر حاضر کے بعض اھل قلم ان خلفاء کی خلافت کو صحیح و درست بتانے کے لئے ھمارے زمانہ کی چیز یعنی جمھوریت اور مغربی لیبرلیزم کا سھارا لیتے ھیں اور عوام پر عوام کی حکومت یا اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی مثال پیش کرتے ھیں جب کہ اس طرح کی توجیھات واقعہ کے وجود میں آنے کے بعد عالم تخیل میں اس کی اسباب تراشی ھے اور خلافت کا ھرگز اس سے کوئی ربط نھیں رھا ھے۔

اب ھم مزید اطمینان کے لئے اس سلسلہ میں بعض قدیم علماء کے اقوال نقل کرتے ھیں: قاضی ایجی اپنی مشھور کتاب شرح مواقف میں لکھتے ھیں: امام کے انتخاب کے لئے کسی فرد کے خلافت پر اجماع یا امت کے اتفاق کی ضرورت نھیں ھے بلکہ اصحاب پیغمبر (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) میں سے ایک یا دو شخص کی بیعت یا پیمان سے ھی اس شخص کی خلافت قانونی صورت اختیار کرلیتی ھے اور اس کی دلیل یہ ھے کہ اصحاب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دینی امور میں کمال ایمان کی وجہ سے صرف حضرت ابوبکر کی رائے کو کافی سمجھا جنھوں نے عمر کو اپنے بعد خلافت کے لئے معین کیا اور نہ صرف تمام مسلمانوں کے اتفاق رائے کو شرط نھیں جانا بلکہ خود مدینہ میں رھنے والے صحابہ کے اتفاق رائے کو بھی ضرورتھیں سمجھا۔(27)

"احکام السلطانیہ" کے مؤلف لکھتے ھیں: بعض لوگ یہ تصور کرتے ھیں خلیفہ کا انتخاب اسلامی شھروں میں رھنے والی بزرگ اسلامی شخصیتوں کی تصویب سے انجام پاتا ھے، جبکہ ابوبکر

سقیفہ بنی ساعدہ میں صرف پانچ افراد کی رائے سے خلیفہ ھوئے ،عمر،ابوعبیدہ ،اسید بن حضیر ،بشر بن سعداور سالم مولیٰ ابوحذیفھ ۔(۲8)

اسلامی خلافت کی تاریخ گواہ ھے کہ عمر نے کی خلافت صرف حضرت ابوبکر کی تعیین کے ذریعہ قانونی ھوگئی اور حضرت عمر نے بھی خلافت کے لئے کسی شخص کے انتخاب کا اختیار چہ نفری کمیٹی کے حوالے کر دیا اور بقیہ تمام مسلمانوں کو انتخاب ھونے اور انتخاب کرنے سے محروم کر دیا۔

قاضی باقلانی لکھتے ھیں : ابوبکر کا انتخاب حضرت عمر کی کوشش اور دوسرے چار افراد کے ذریعہ انجام پایا؟۔(29) حضرت امیرالمومنین علی ں کی شھادت کے بعد خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے خاندانوں میں موروثی سلطنت کی شکل اختیار کر گئی ،جس کی کھانی بھت ھی دردناک ھے اور یھاں اس کے بیان کی گنجائش بھی نھیں ھے۔

نویں فصل

اسلام میں مشورہ

اس میں کسی بحث کی ضرورت نھیں کہ مشورہ کے ذریعہ بھت سی انفرادی واجتماعی مشکلات حل ھوتی ھیں۔دوفکروں کاٹکراو گویا بجلی کے دومثبت ومنفی تاروں کےٹکرانے کے مانند ھےجس سے روشنی پیدا ھوتی ھےاورانسان کی زندگی کی راہ روشن ھوجاتی ھے۔

مشورہ مشکلات کےحل کے لئے اس قدراھم ھےکہ قرآن کریم پیغمبراکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)کوحکم دیتاھے کہ زندگی کےمختلف امورمیں مشورہ کرو۔چنانچہ فرماتاھے:

"وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین" (30)

یعنی اپنے فیصلوں میں ان سے مشورہ کرواور جب فیصلہ کرلوتوخداپربھروسہ کرو۔بلاشبھہ خدا توکل کرنے والوں کودوست رکھتاھے۔

خداوندعالم ایک دوسری آیت میں صاحبان ایمان کی یوں تعریف کرتاھے:

"والذین استجابوالربھم واقامواالصلوٰۃوامرھم شوریٰ بینھم ومما رزقناھم ینفقون" (31)

یعنی جولوگ اپنے خدا کی آواز پر لبیک کھتے ھیں اورنمازقائم کرتے ھیں اوران کے فیصلوں اورکاموں کی بنیادان کا آپسی مشورہ ھے اورجوکچہ خداانھیں رزق دیتاھے اس میں سے انفاق کرتے ھیں۔

لھذاھم دیکھتے ھیں کہ عقل اورنقل دونوں نے مشورہ کی اھمیت کوواضح کیاھےاورکیااچھا ھو کہ مسلمان اسلام کےاس عظیم دستورکی پیروی کریں جس میں ان کی سعادت وخوشنختی اورسماج کی ترقی پوشیدہ ھے۔

پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ صرف لوگوں کو یہ روش اپنانے کا حکم دیتے تھے بلکہ آپ نے اپنی زندگی میں خود بھی خدا کے اس فرمان پر عمل کیا ھے۔ جنگ میں جبکہ ابھی دشمن کا سامنا نھیں ھوا تھا، بدر کے صحرا میں آگے بڑھنے اور دشمن سے مقابلہ کے سلسلہ میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور ان سے فرمایا: "اشیروا الیّ ایھا الناس" قریش سے جنگ کے سلسلہ میں تم لوگ اپنا نظریہ بیان کرو کہ ھم لوگ آگے بڑھکر دشمن سے جنگ کریں یا یھیں سے واپس ھوجائیں؟ مھاجرین وانصار کی اھم شخصیتوں نے دو الگ الگ اور متضاد مشورے دیئے لیکن آخرکار پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انصار کا مشورہ قبول کیا۔(32)

اُحد کی جنگ میں بڑے بوڑھے لوگ قلعہ بندی اور مدینہ میں ھی ٹھھرنے کے طرفدار تھے تاکہ برجوں اور مکانوں کی چھتوں سے دشمن پر تیراندازی اور پتھروں کی بارش کر کے شھر کا دفاع کریں، جبکہ جوان اس بات کے طرفدار تھے کہ شھر سے باھر نکل کر جنگ کریں اور بوڑھوں کے نظریہ کو زنانہ روش سے تعبیر کرتے تھے۔ یھاں پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دوسرے نظریہ کو اپنایا۔(33) جنگ خندق میں پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک فوجی کمیٹی تشکیل دی اور مدینہ کے حساس علاقوں کے گرد خندق کھودنے کا جناب سلمان کا مشورہ قبول کیا اور اس پر عمل کیا۔(34)

طائف کی جنگ میں لشکر کے بعض سرداروں کے مشورہ پر فوج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا۔(35)

لیکن اس بات پر توجہ ھونی چاھئے کہ کیا صرف مشورہ اور تبادلۂ خیالات ھی مشکلات کا حل ھے

یا یہ کہ پھلے عقل وفکر کے اعتبار سے بانفوذ مرکزی شخصیت جلسہ تشکیل دے اور تمام آراء کے در میان سے ایک ایسی رائے منتخب کرے اور اس پر عمل کرے جو اس کی نظر میں بھی حقیقت سے قریب ھو۔

معمولاً مشوروں کے جلسوں میں مختلف افکار ونظریات پیش کئے جاتے ھیں اور ھر شخص اپنے نظریہ کا دفاع کرتے ھوئے دوسروں کی آراء کو ناقص بتاتا ھے ۔ایسے جلسہ میں ایک مسلم الثبوت رئیس ومرکزی شخص کا وجود ضروری ھے، جو تمام لوگوں کی رائے سنے اور ان میں سے ایک قطعی رائے منتخب کرے۔ ورنہ دوسری صورت میں مشورہ کا جلسہ کسی نتیجہ کے بغیر ھی ختم ھو جائے گا۔

اتفاق سے وہ پھلی ھی آیت جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کا حکم دیتی ھے مشورہ کے بعد سے یوں خطاب کرتی ھے: "فاذا عزمت فتوکل علی اللہ" پس جب تم فیصلہ کر لو تو خدا پر بھروسہ کرو۔ اس خطاب سے مراد یہ ھے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ بات کھی جا رھی ھے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کرنے والی مرکزی شخصیت خود پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات ھے لھذا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ھی فیصلہ کرنا اور خدا پر بھروسہ کرنا چاھئے۔

جمعیت کا پیشوا ورھبر، جس کے حکم سے مشورہ کا جلسہ تشکیل پایا ھے ممکن ھے کہ لوگوں کے درمیان کسی تیسرے نظریہ کو اپنائے جو اس کی نظر میں "اصلح" یعنی زیادہ بھتر ھو۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنے اصحاب کے عمومی خیالات کی

مخالفت کی اور مسلمانوں اور قریش کے بت پرستوں کے درمیان صلح کی قرارداد باندھی اور خود صلح یا صلح نامہ کے بعض پھلوؤں سے متعلق اپنے اصحاب کے اعتراضات پر کان نھیں دیئے اور زمانہ نے یہ بات ثابت کردی کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں مفید تھا۔

اسلام میں مشورہ اور جمھوری حکومتوں کے مشورہ جس میں ملکی قوانین پاس کرنا پارلمینٹ اور سینٹ دونوں مجلسوں کے اختیار میں ھے اور حکومت کا صدر صرف ان دو مجلسوں کے تصویب شدہ قوانین کا اجرا کرنے والا ھے ۔ میں زمین آسمان کا فرق ھے۔یھاں حکومت کا رئیس وحاکم جوخود پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ھیں، اقلیت یا اکثریت کی آراء کے مطابق عمل کرنے پر مجبور نھیں ھے۔ بلکہ آخری رائے یا آخری فیصلہ کا اظھار، چاھے وہ اھل مجلس کی رائے کے،موافق ھو یا مخالف ،خود پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوپر ھے۔اور یہ پھلے عرض کیا جا چکا کہ مشورہ کے بعد قرآن کریم پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیتا ھے کہ اب آپ خدا پر توکل کریں، فیصلہ کریں اور آگے بڑھیں۔

دوسری آیت کا مطلب بھی یھی ھے۔دوسری آیت تبادلۂ خیال کو باایمان معاشرہ کی ایک بھترین خوبی شمار کرتی ھے۔لیکن یہ باایمان معاشرہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں ھرگز ایک نافذ اور مطلق العنان رئیس سے خالی نھیں تھا اور عقل یہ کھتی ھے کہ آنحضرت کی رحلت کے بعد بھی باایمان معاشرہ کو ایسی شخصیت سے خالی نھیں رھنا چاھئے ۔ یہ آیت ایسے معاشروں کی طرف اشارہ کررھی ھے جنھوں نے حاکم ورھبر کے تعین کا مرحلہ طے کرلیا ھے

اوراب دوسرے مسائل میں مشورہ یا تبادلۂ خیال کرتے ھیں۔
اس بیان سے یہ بات واضح ھوجاتی ھے کہ بعض علمائے اھل سنت کا ان آیات سے مشورہ کے ذریعہ خلیفہ کے انتخاب کوصحیح قرار دینا درست نھیں ھے۔کیونکہ جیسا کہ ھم عرض کر چکے ھیں مذکورہ آیات ان معاشروں سے متعلق ھےں جن میں حاکم کے تعین کی شکل پھلے سے حل ھوچکی ھے اور مشورتی جلسے اس کے حکم سے تشکیل پاتے ھیں تا کہ مسلمان اپنے دوسرے امور میں تبادلۂ خیال کریں، خاص طور سے پھلی آیت جو صاف طور سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے جو مسلمانوں کے رھبر ھیں۔خطاب کرتی ھے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کرلو اور اس کے مطابق عمل کرو۔
اس کے علاوہ عمومی افکار و خیالات کی طرف رجوع اس سلسلہ میں ھے جس میں خداوند عالم کی طرف سے مسلمانوں کے لئے کوئی فریضہ معین نہ کیا گیا ھو۔ایسے میں مسلمان تبادلۂ خیال کے ذریعہ اپنا فریضہ معلوم کر سکتے ھیں،لیکن جس امر میں نص کے ذریعہ سب کا فریضہ معین کیا جاچکا ھے اس میں مشورہ کی ضرورت ھی نھیں ھے۔
یھی وجہ ھے کہ جب "حباب منذر" پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور فوج کے مرکز کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی درخواست کی تو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خطاب کر کے عرض کیا "فان کان عن امر سلّمنا وان کا عن الرای فالتاخر عن حصنھم" (36) یعنی اگر اس سلسلہ میں کوئی الٰھی حکم ھے تو ھم تسلیم ھیں اور اگر ایسی بات ھے کہ ھم اس میں اپنی رائے دے سکتے ھیں تو لشکر اسلام کی مرکزی کمان کو دشمن کے قلعہ سے دور میں ھی بھلائی

ھے۔

حضرت علی ں کی خلافت وجانشینی کا موضوع ایسا مسئلہ ھے جسے بھت سے نقلی دلائل نے ثابت اور واضح کردیا ھے اور پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خدا کے حکم سے بھت سے موقعوں پر مثلاً یوم الدار، غدیر خم، اور بیماری کے ایام میں ان کی خلافت وجانشینی کوصراحت سے بیان کردیا ھے۔ پھراب مشورہ کے ذریعہ آنحضرت کی جانشینی کی تعیین کا مسئلہ حل کیا جانا ھے کیا معنی رکھتا ھے۔ کیا یہ عمل نص کے مقابلہ میں اجتھاد اور خدا کے قطعی حکم یا دلیل کے مقابل اپنے نظریہ کا اظھار نھیں ھے؟

قرآن مجید ایک آیت کے ضمن میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ھے: جب پیغمبر اکرم کے منہ بولے بیٹے زید نے اپنی بیوی جناب زینب کوطلاق دے دی اور پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خدا کے حکم سے جناب زینب سے شادی کر لی تو یہ بات مسلمانوں کو بھت بری لگی کیونکہ جاھلیت کے زمانہ میں منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا جاتا تھااور جس طرح نسبی بیٹے کی بیوی سے شادی ناپسندیدہ اور حرام تھی اسی طرح منہ بولے بیٹے کی بیوی سے بھی شادی ناروااور قبیح سمجھی جاتی تھی۔

مسلمانوں کو یہ توقع تھی کہ آنحضرت ھمارے نظریات کے پیرو ھوں گے اور ھمارے خیالات کا احترام کریں گے۔ جبکہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ عمل خداوند عالم کے حکم سے اور جاھلیت کے رسم ورواج کو غلط قرار دینے کے لئے انجام دیا تھا۔ اور ظاھر ھے کہ خدا کے حکم کے ھوتے ھوئے عام لوگوں کے افکار وخیالات کی طرف توجہ دینا کوئی معنی نھیں رکھتا۔

یھی وجہ ھے کہ قرآن کریم نے مندرجہ ذیل آیت کے ذریعہ ان موارد میں اپنی مداخلت اور اپنے خیالات کے اظھار کو شدت سے محکوم کیا ھے، جن میں اللہ کے حکم نے مسلمانوں کے لئے کوئی خاص فریضہ معین کردیا ھو۔قرآن فرماتا ھے:

"وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ و رسولہ امرا ان یکون لھم الخیرة من امرھم ومن یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلالا مبینا" (37)

"یعنی جب خدااوراس کا رسول کسی سلسلہ میں حکم دے دیں پھر کسی مومن یا مومنہ کو اپنے امور میں کوئی اختیار نھیں ھے (انھیں بھر حال خدا کے حکم کی پیروی کرنا ھوگی) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کے فرمان سے سرتابی کرے گا وہ کھلا ھوا گمراہ ھے"

حوالے

1و2۔ان مطالب کی تفصیل دوسرے حصہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(3)۔الصواعق المحرقھ، ابن حجر، فصل دوم۔باب نھم، حدیث 41 ص/57

(4)۔رسالۃ الاسلام، طبع مصر، شمارہ سوم، گیارھواں سال

(5) شرح تجرید، علاء الدین قوشجی ص/472۔اس کے علاوہ اور بھی تعریفیں علماء اھل سنت نے بیان کی ھیں لیکن اختصار کے پیش نظر ھم ان سے گریز کرتے ھیں۔

(6) التمھید ص/186

(7) شرح مقاصد، ج/2، ص/271

(۸) چونکہ شیعہ علماء اھل سنت کے نظریہ کے برخلاف، امامت کو ایک الھی منصب سمجھتے ھیں

لھذا وہ امامت کی یوں تعریف کرتے ھیں "الامامۃ ریاسۃ عامۃ الھیۃ فی امورالدین والدنیاو خلافۃ عن النبی" امامت لوگوں کے دینی و دنیاوی امور میں ایک عام الٰھی سر پرستی اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشینی ھے۔

(9) مائدہ/3۔یعنی آج میں نے تمھارا دین مکمل کردیا۔

(10) اسلام کے فروعی احکام سے متعلق امت کے حکام اور خلفاء کی لاعلمی کی ان رودادوں کی وضاحت کی ھمیں ضرورت نھیں ھے ان قضیوں کی تشریح تاریخ حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں موجود ھے۔علامہ امینی نے اپنی گرانقدر کتاب "الغدیر" کی چھٹی،ساتویں،اور آٹھویں جلد میں خلفاء کی عملی لیاقت کے سلسلہ میں تفصیل سے گفتگو کی ھے۔شائقین مزید معلومات کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کریں۔

(11)۔تاریخ طبری،ج/2،ص/172

(12) تاریخ کامل،ج/2،ص/63

(13)۔تاریخ طبری ج/2،ص/62-63 تاریخ کامل ج/2،ص/40-41 مسند احمد ،ج/1،ص/111۔اور دیگر مآخذ

(14) سورہ احقاف/15

(15) سورہ بقرہ/232

(16)۔حضرت امیر المومنین علی اس قسم کی آیات کے بارے میں فرماتے ھیں: "کتاب اللہ تبصرون بہ،وتسمعون بہ وینطق بعضہ ببعض ویشھد بعضہ علی بعض"

(17)اصول کافی،ج/1ص/170

(۱۸)اصول کافی،ج/1ص/172

(19)اصول کافی،ج/1ص/17۸

(20)۔سورہ طور/30

(21)الدرجات الرفیعہ ص/77 حضرت علی ں نے اس موقع پر ابوسفیان سے اپنا وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:"مازلت علی والاسلام واھلہ" تو ھمیشہ اسلام اور اھل اسلام کا دشمن رھا ھے۔

الاستیعاب،ج/2ص/690

(22)یہ حدیث شیعہ وسنی دونوں ماخذ میں تواتر کے ساتھ آئی ھے ※

(23)شفاء،الالھیات،فصل یکم از مقالہ دھم ص/۴۸۸،تحقیق آیۃا※※※ حسن زادہ آملی

(24)سیمائے شجاعان،ص/33و34

(25)سیمائے شجاعان،ص/34

(26)سورہ بقرہ/216

(27)شرح مواقف،ج/3ص/265

(۲۸)الاحکام السلطانیہ،ص/4

(29)التمھید،ص17۸۔

(30)آل عمران/159

(31)شوریٰ/3۸

(32) سیرہ ابن ھشام، ج/1 ص/615، مغازی واقدی ص/4۸

(33) سیرہ ابن ھشام، ج/2، ص/63، مغازی واقدی، ج/، 1 ص/209

(34) تاریخ کامل، ج/2 ص/122

(35) مغازی واقدی، ج/3 ص/925

(36) مغازی، واخدی، ج/3 ص/925

(37) احزاب/36

دسویں فصل

یکطرفہ فیصلہ نہ کریں

اسلام میں وہ تنہا خلیفہ، جومھاجر و انصار کی قریب با اتفاق اکثریت سے منتخب ھوا، امیر المؤمنین علی علیہ السلام تھے۔ اسلامی خلافت کی تاریخ میں یہ امر بالکل بے نظیر تھا اور اس کے بعد بھی اس کی کوئی مثال نظر نھیں آتی۔

اس دوران جب معاویہ (جس نے مدتوں پھلے شام میں اپنی بادشاھت اور مطلق العنانیت کی داغ بیل ڈالی تھی اور خاندان رسالت کے ساتھ دیرینہ اور عمیق بغض وعداوت رکھتا تھا) اس امر سے آگاہ ھوا کہ مھاجرین وانصار نے حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ منتخب کرلیا ھے، تو سخت برھم ھوا اور امام (ع) سے بیعت کرنے کے لئے تیار نہ ھوا۔ اس نے نہ صرف امام (ع) کی بیعت کرنے سے انکار کیا بلکہ حضرت (ع) پر حضرت عثمان کے قتل اور اس کے قاتلوں کی حمایت کی تھمت بھی لگادی!

امام (ع)، معاویہ کو خاموش کرنے اور اس کے لئے ھر قسم کے عذر کے راستوں کو مسدود کرنے کے لئے اپنے ایک خط میں اسے تحریر فرماتے ھیں کہ:

"وھی لوگ جنھوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی، میری بھی بیعت کرچکے ھیں، اگر ان کی خلافت کو اس لحاظ سے قابل احترام سمجھتے ھو کہ مھاجرین وانصار نے ان کی بیعت کی تھی تو یہ شرط میری خلافت میں بھی موجود ھے"۔

امام (ع) کے خط کا متن:

"انه بایعنی القوم الّذین بایعوا ائبابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوهم علیه فلم یکن للشاهد ائن یختار و لا للغائب ائن یردو إنّما الشوریٰ للمهاجرین و الائنصار اجتمعوا علی رجل و سموه إماماً کان ذلك (لله) رضا" (نهج البلاغه، خط نمبر/6)

"جن افراد نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی، وہ میرے ساتھ بھی بیعت کر چکے ھیں اس صورت میں مدینہ میں حاضر شخص کو کسی اور کو امام منتخب کرنے اور مرکزِ شوریٰ سے دور کسی فرد کو ان کا نظریہ مسترد کرنے کا حق نھیں ھے۔ شوریٰ کی رکنیت صرف مھاجر و انصار کا حق ھے۔ اگر انھوں نے کسی شخص کی قیادت و امامت پر اتفاق نظر کیا اور اسے امام کھا، تو یہ کام خدا کی رضا مندی کا باعث ھوگا۔

امام علیہ السلام کے اس خط کا مقصد، معاویہ کو خاموش کرنے، اس کی ھر قسم کی بھانہ تراشی اور خودغرضی کا راستہ بند کرنے اور قرآن مجید کی اصطلاح میں "مجادلہ احسن" کے سوا اور کچھ نھیں تھا۔ کیونکہ معاویہ شام میں حضرت عمر اور اس کے بعد حضرت عثمان کی طرف سے مدتوں گورنر رہ چکا تھا اور انھیں خلیفہ رسول اور اپنے آپ کو ان کا نمائندہ جانتا تھا۔ ان حضرات کی خلافت کا احترام اسی جھت سے تھا کہ وہ مھاجر و انصار کی طرف سے منتخب ھوئے تھے، اور بالکل یھی انتخاب واضح اور مکمل صورت میں امام علیہ السلام کے حق میں بھی انجام پایا تھا اس لئے کوئی وجہ نھیں تھی کہ ایک کو قبول اور دوسرے کو مسترد کیا جائے۔

امام علیہ السلام نے قرآن مجید میں حکم شدہ مجادلۂ کے ذریعہ (38) اپنی خلافت کے بارے میں معاویہ کی مخالفت کی مذمت کرتے ھوئے فرمایا:

”جنھوں نے ابوبکراورعمروعثمان کی بیعت کی تھی، وھی میری بیعت بھی کر چکے ھیں، لھذا اب تم میری خلافت کو جائز کیوں نھیں سمجھتے ھو؟“

مجادلہ کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نھیں ھے کہ جس چیز کومخالف مقدس اور محترم جانتا ھوا سے استدلال کی بنیاد قرار دیکر مخالف کواسی کے اعتقاد کے ذریعہ شکست دی جائے۔اس لحاظ سے، یہ خط ھرگز اس بات کی دلیل نھیں ھے کہ امام علیہ السلام مھاجرین وانصار کی شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ کے انتخاب کوسو فیصد صحیح جانتے تھے اور امام (ع) کا عقیدہ بھی یھی تھا کہ خلیفہ کا انتخاب مھاجرین وانصار کی مشورت کے ذریعہ ھی انجام پانا چاھئے اور مسئلہ امامت ھرگز ایک انتصابی مسئلہ نھیں بلکہ انتخابی مسئلہ ھے۔

اگر امام علیہ السلام کا مقصد یھی ھوتا،توانھیں اپنے خط کوگذشتہ تین خلفاء کی بیعت کی گفتگو سے شروع نھیں کرنا چاھئے تھا، بلکہ انھیں ان خلفاء کی خلافت کی طرف اشارہ کئے بغیر اپنی بات کو یوں شروع کرنا چاھئے تھا:

”مھاجرین وانصار نے میری بیعت کی ھے اور جس شخص کی وہ بیعت کرلیں وہ لوگوں کا امام و پیشوا ھوگا“

یہ جو امام بعد والے جملوں میں فرماتے ھیں: ” فان اجتمعوا علی رجل وسموہ اماماً، کان ذلک (للہ) رضا“ تو یہ احتجاج بھی مخالف کے عقیدہ کی روشنی میں ھے اور کلمہ ”اللہ“ نھج البلاغہ کے صحیح نسخوں میں موجود نھیں ھے بلکہ مصر میں چھپے نسخوں میں بریکٹ کے اندر پایا جاتا ھے (اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ھے کہ امام (ع) کے خط میں اس کلمہ (اللہ) کے ھونے میں شک پا

یا جاتا ھے)حقیقت میں امام (ع) فرماتے ھیں کہ: اگر مسلمان اپنے پیشوا کے انتخاب میں ایک فرد پر اتفاق کریں، تو ایسا کام پسندیدہ ھے، یعنی تم لوگوں کے عقیدہ کے مطابق یہ کام پسندیدہ اور رضامندی کا باعث ھے اوریھی کام تو میرے بارے میں انجام پایا ھے، اب کیوں میری بیعت کرنے میں مخالفت کرتے ھو؟

سب سے پھلا شخص، جس نے اس خطبہ سے اھل سنت کے نظریہ کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں استدلال کیا ھے، شارح نھج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ھے۔ اس نے اس خط میں اور نھج البلاغہ کے دیگر خطبوں میں موجود قرائن کے سلسلہ میں غفلت کے سبب اس سے اھل سنت کے نظریہ کی حقانیت پر استدلال کیا ھے اور امام (ع) کے فرمائشات کو ایک سنجیدہ امر سمجھتے ھوئے اسے آپ (ع) کا عقیدہ تصور کیا ھے (39)۔ شیعہ علماء جب بھی اس خطبہ کی شرح پر پھنچتے ھیں تو انھوں نے وھی مطلب بیان کیا ھے جس کا ھم اوپر اشارہ کر چکے۔

تعجب ھے کہ احمد کسروی نے اپنی بعض تحریروں میں اس خطبہ کو بنیاد بنا کر اسے شیعوں کے عقیدہ کے بے بنیاد ھونے کی دلیل قرار دیا ھے اور اس سے بڑہ کر تعجب ان لوگوں پر ھے جو ان دو افراد کی باتوں کو نیا روپ دیکر اسے دھوکہ کھانے والوں کے بازار میں ایک نئی چیز کے طور پر پیش کرتے ھیں اور یہ نھیں جانتے کہ ھر زمانے میں مذھب تشیع کے ایسے محافظ موجود ھوتے ھیں جو خود غرضوں کی سازشوں کا پردہ چاک کر دیتے ھیں۔

یک طرفہ فیصلہ نہ کریں!

کسی فیصلہ کے لئے خودسری سے کام نهیں لینا چاهئے اور" نهج البلاغہ" میں موجود امام (ع) کے دوسرے ارشادات سے چشم پوشی نهیں کرنا چاهئے ، بلکہ امام علیہ السلام کے تمام بیانات سے استفادہ کرکے ایک نتیجہ اخذ کرنا چاهئے۔

یهی امام جواس خط میں لکھتے هیں:

" جن لوگوں نے گذشتہ تین خلفا کی بیعت کی تھی ،انهوں نے میری بھی بیعت کی هے اور جب کبھی مهاجر وانصار کسی کی امامت کے بارے میں اتفاق رائے کا اظهار کریں،تو وہ لوگوں کا پیشوا هوگا اور کسی کو اس کی مخالفت کرنے کا حق نهیں هے"۔

خلافت خلفاء کے بارے میں خطبہ شقشقیہ میں فرماتے هیں:

" خدا کی قسم !فرزند ابوقحافہ نے پیراهن خلافت کو کھینچ تان کر پهن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا خلافت کی چکی میرے وجود کے گرد گردش کرتی هے اور میرا خلافت میں وهی مقام هے جو چکی کے اندر اس کی کیل کا هوتا هے۔میں وہ (کوہ بلند) هوں جس سے علوم ومعارف کا سیلاب نیچے کی طرف جاری هے اور کسی کے وهم وخیال کا پرندہ بھی مجھ تک نهیں پهنچ سکتا۔لیکن میں نے جامہ خلافت کو چھوڑ دیا اور اس سے پهلوتهی کرلی اور سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے هوئے هاتھوں (کسی ناصر و مددگار کے بغیر) سے حملہ کروں یا اس سے بھیانک تیرگی پر صبر کرلوں ،جس میں سن رسیدہ بالکل ضعیف اور بچہ بوڑھا هوجاتا هے اور مؤمن اس میں رنجیدہ هوتا هے یهاں تک کہ وہ اپنے پروردگار کے پاس پهنچ جاتا هے مجھے اس اندھیر پر صبر هی قرین عقل نظر آیا۔لهذا میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں (غم واندوہ

کے تنکے کی) خلش تھی اور حلق میں (غم و رنج کی) ھڈی پھنسی ھوئی تھی۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکہ رھا تھا، یھاں تک کہ پھلے (ابوبکر) نے اپنی راہ لی اور وہ اپنے بعد خلافت ابن خطاب کو دے گیا۔ تعجب ھے کہ وہ زندگی میں تو خلافت سے سبکدوش ھونا چاھتا تھا۔ لیکن اپنے مرنے کے بعد اس کی بنیاد دوسرے کے لئے استوار کرتا گیا۔ ان دونوں نے خلافت کو دو پستانوں کے مانند آپس میں بانٹ لیا اس نے خلافت کو ایک سخت و درشت جگہ قرار دے دیا۔

آپ نے مزید فرمایا:

"یھاں تک کہ دوسرا (عمر) بھی اپنی راہ لگا، اور اس نے خلافت کا معاملہ ایک جماعت کے حوالے کر دیا۔ اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک فرد قرار دیا۔ اے اللہ! میں تجہ سے اس شوریٰ کی تشکیل اور اس کے مشورہ سے پناہ مانگتا ھوں جبکہ انھوں نے مجھے بھی اس کا ھم ردیف قرار دے دیا۔۔(40)

امام علیہ السلام اپنے ایک خط میں اپنی مظلومیت اور آپ (ع) سے بیعت لینے کے طریقے پر سے پردہ اٹھاتے ھوئے معاویہ کے ایک خط کے جواب میں ××× جس میں اس نے حضرت (ع) کو لکھا تھا کہ انھیں اونٹ کی ناک میں نکیل ڈال کر کھینچنے کی صورت میں ابوبکر کی بیعت کرنے کے لئے کھینچ کر لے گئے تھے لکھتے ھیں:

" تم نے لکھا تھا کہ: مجھے اونٹ کی ناک میں نکیل ڈالکر کھینچنے کی صورت میں بیعت کرنے کے لئے کھینچ کر لئے گئے تا کہ میں بیعت کروں۔ خدا کی قسم تم نے چاھا کہ میری ملامت کرو

لیکن اس کے بجائے تم میری ستائش کر گئے هو اور مجھے رسوا کرنا چاهتے تھے لیکن خود رسوا هو گئے هو (کیونکہ تم میری مظلومیت کا واضح طور پر اعتراف کر گئے هو) کیونکہ مسلمان کے لئے جب تک اس کے دین میں شک اور یقین میں خلل نہ هو مظلومیت اور ظلم وستم سهنے میں کوئی عار نهیں هے“(41)

کیا امام (ع) کی اپنی مظلومیت کے بارے میں اس صراحت کے باوجود کہ آپ (ع) سے زورزبردستی اور جبراً بیعت لی گئی هے، یہ تصور کیا جاسکتا هے کہ آپ (ع) نے خلفاء کی خلافت کی تائید کی هوگی اور ان کو امت کے امام و پیشوا کے طور پر تسلیم کیا هوگا ؟ هرگز نهیں، لهذا اس سے ثابت هوتا هے کہ زیرِ بحث خط میں آپ (ع) کا مقصد مجادلہ اور طرف کولا جواب کرنا تھا۔

امام علیہ السلام اپنے ایک اور خط میں جسے آپ (ع) نے اپنے گورنر مالک کے هاتھ مصر بھیجا تھا لکھتے هیں:

”خدا کی قسم! میں کبھی سوچ بھی نهیں سکتا تھا کہ عرب پیغمبر کے بعد خلافت کو آپ کے خاندان سے نکال کر کسی دوسرے کو سونپ دیں گے اور همیں اس سے محروم کردیں گے۔ ابو بکر کی بیعت کے لئے لوگوں کی پیشقدمی نے همیں رنج ومصیبت میں ڈالدیا“(42)

گیارهویں فصل

سقیفہ بنی ساعدہ کی غم انگیز داستان

پیغمبر کی تشویش تھیں امت جاهلیت کی طرف پلٹ نہ جائے!

قرآن مجید کی آیات اور تاریخی قرائن اس امر کے شاهد هیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی معاشرے کے مستقبل کے بارے میں سخت فکرمند تھے۔ اور (غیبی الهامات سے قطع نظر) بعض سلسلہ وار ناگوار حوادث کو دیکھتے هوئے آپ کے ذهن میں یہ احتمال تقویت پارها تھا کہ ممکن هے ایک گروه یا بهت سے لوگ آپ (ع) کی رحلت کے بعد جاهلیت کے زمانے کی طرف پلٹ جائیں اور سنن الهی کو پس پشت ڈال دیں اس احتمال اور خدشہ نے اس وقت آپ (ع) کے ذهن میں اور زیادہ قوت پائی جب آپ (ع) نے جنگ اُحد میں (جب دشمن کی طرف سے پیغمبر اسلام کے قتل هونے کی افواه پھیلائی گئی تھی) اس بات کا عینی مشاهده کیا کہ مسلمانوں کی اکثریت نے بھاگ کر پهاڑوں اور دور دراز علاقوں میں پناه لے لی۔ اور بعض لوگوں نے فیصلہ کرلیا کہ منافقوں کے سردار "عبداللہ ابن ابی" کے ذریعہ ابوسفیان سے امان حاصل کریں۔ اتنا هی نهیں بلکہ ان لوگوں کا مذهبی عقیده اتنا کمزور اور متزلزل هوا تھا کہ وه خدا کے بارے میں بدگمان هوکر جاهلانہ افکار کے مرتکب هو گئے تھے۔ قرآن مجید نے اس راز کا یوں پرده چاک کیا هے:

(وَ طَآئِفَةٌ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ يَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَقِّ ظَنَّ الۡجَاهِلِيَّةِ يَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٍ) (43)

(اصحاب پیغمبر میں سے ایک گروه کو) اپنی جان کی اس قدر فکر تھی کہ وه خدا کے بارے میں دور ان جاهلیت کے جیسے باطل خیالات کے مرتکب هو گئے تھے اور وه یہ کهہ رهے تھے کہ آیا (مسلمین پر حاکمیت) جیسی کوئی چیز هم پر هے؟

قرآن مجید ایک اور آیہ کریمہ میں اصحاب رسول خدا کے آپسی اختلافات کے بارے میں اشارتاً خبر دیتے ھوئے فرماتا ھے:

(وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئاً وَ سَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ) (44)

”اور محمد تو صرف خدا کی جانب سے ایک رسول ھیں جن سے پھلے بھت سے رسول گذر چکے ھیں کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل ھوجائیں تو تم الٹے پیر پلٹ جاؤ گے؟ تو جو بھی ایسا کرے گا وہ خدا کا کوئی نقصان نھیں کرے گا اور خدا عنقریب شکر گزاروں کو ان کی جزا دے گا“۔

یہ آیہ شریفہ اصحاب رسول خدا کو دو حصوں یعنی عصر جاھلیت کی طرف لوٹ جانے والے اور ”ثابت قدم وشکر گزار“ گروہ میں تقسیم کرکے اشارتاً یہ بیان کرتی ھے کہ پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد مسلمان افتراق واختلاف کے شکار ھوکر دو گروہ میں بٹ جائیں گے ایک گروہ عصر جاھلیت کی طرف پلٹ جائے گا اور دوسرا گروہ ثابت قدم وشکر گذار رھے گا۔

کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ھے کہ پیغمبر اسلام ایک ایسی امت کو جو اختلاف وافتراق سے دو چار ھو، اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ان کے لئے ایک امام وپیشوا اور حاکم وفرماں روا مقرر نہ فرمائیں؟

پیغمبر کے لئے یا قومی اتحاد کے قائل افراد کے لئے بھی یہ ھرگز جائز نھیں کہ ایک ایسے لوگوں کی اجتماعی وسیاسی زندگی کی باگ ڈور خود ان کے ھاتھ میں دیدیں، بلکہ حالات پر قابو رکھنے کے لئے لازم بن جاتا ھے کہ ایک لائق اور قابل شخص کو امت کے امام وپیشوا کی حیثیت سے

مقرر کیا جائے تا کہ حتی الامکان اختلاف وافتراق اور نا امنی سے معاشرے کو بچایا جاسکے۔
پیغمبر اسلام جانتے تھے کہ آپ کی امت میں اختلاف وافتراق پایا جاتا ھے اور یہ امت بھی گزشتہ امتوں کی طرح مختلف گروھوں میں بٹ جائے گی ،حتی آپ نے اپنی امت کے بارے میں پیشینگوئی کے ذریعہ فرمایا ھے:

"ستفترق امتی علی ثلاث و سبعین فرقة، فرقة ناجية و الباقون فی النار"
عنقریب میری امت 73 فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے صرف ایک گروہ اھل نجات ھوگا اور باقی فرقے جھنمی ھوں گے" (45)

یھاں یہ سوال پیدا ھوتا ھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اطلاع وآگاھی رکھنے کے باوجود کہ امت کی رھبری کا انتخاب بھت سے اختلافات کا سد باب بن سکتا ھے کس طرح اس اھم امر کو ایک متلون مزاج جمعیت کے سپرد کیا، جس کے نتیجہ میں امت میں یہ وسیع اختلافات و شگاف پیدا ھوگیا؟!

اسلامی سماج، ان دنوں مختلف گروھوں میں بٹ گیا تھا اور ھر گروہ ایک آرزو اور مقصد رکھتا تھا: انصار دو معروف گروھوں یعنی "اوس" و "خزرج" پر مشتمل تھے، اور مھاجر، بنی ھاشم اور بنی امیہ کے علاوہ قبائل "تیم" اور "عدی" پر مشتمل تھے۔ ھر گروہ چاھتا تھا معاشرے کی قیادت اس کے ھاتہ میں آجائے اور ان کے قبیلہ کا سردار اس عھدہ کا مالک بنے۔
کیا ان متضاد گروھوں کے ھوتے ھوئے امت میں اتحاد و یکجھتی اور دین کے سلسلے میں مسلمانوں کے استحکام و پائیداری کی امید کی جاسکتی ھے یا سب سے پھلے اختلاف وافتراق

کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاھیے تب ایسی امید رکھنی چاھئے؟

پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی صفوں میں جو سب سے بڑی دراڑ پیدا ھوئی اور جس سے ان کے اتحاد و یکجھتی پر کاری ضرب لگی وہ اسلامی قیادت کے بارے میں اختلاف نظر کا سبب تھا۔ اگر مسلمان اس موضوع پر اختلاف و افتراق کے شکار نہ ھوتے تو بھت سے اختلافات قیادت کے مسئلہ میں اتفاق نظر اور اتحاد کی وجہ سے حل ھوجاتے۔ لیکن اسی اھم اور بنیادی امر پر اختلاف ھی بعد والے اختلافات، جنگوں اور فتنوں کا سبب بنا نتیجہ کے طور پر امت مختلف گروھوں اور جماعتوں میں تقسیم ھوگئی اور بعض گروہ ایک دوسرے کی مخالفت اور ٹکراؤ پر اتر آئے۔

اھل سقیفہ کی منطق

قرآن مجید یاران پیغمبر کو تنبیہ کرتا ھے کہ مبادا آپ کی رحلت کے بعد وہ زمانہ جاھلیت کے افکار کی طرف پلٹ جائیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ھوئے گروہ کی سرگزشت کی تحقیقات اور مطالعہ سے بخوبی معلوم ھوتا ھے کہ کس طرح اس دن پوشیدہ اسرار اور کینہ وعداوت سے پردے اٹھ گئے اور اصحاب رسول کی گفتگو میں ایک بار پھر قومی اور قبیلہ ای تعصّبات اور جاھلیت کے افکار رونما ھوئے اور واضح ھوگیا کہ اسلامی تربیت نے ابھی بھت سے اصحاب رسول کے دلوں کی گھرائیوں تک رسوخ نھیں کیا تھا اور اسلام، جاھلیت کے منحوس چھرے پر ایک نقاب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اس تاریخی واقعہ کے مطالعہ اور تحقیق سے بخوبی معلوم ھوتا ھے کہ اس اجتماع کا مقصد کیا تھا، جھگڑالوں تقریروں، ایک دوسرے پر حملوں کا مقصد ذاتی منفعت طلبی اور سود جوئی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ھر شخص خلافت کا لباس شائستہ ترین شخص کو پھنانے کے بجائے اپنے بدن پر زیب تن کرنے کی کوشش میں تھا، اور جو موضوع اس مجلس میں زیر بحث نہ آیا وہ اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت عامہ یا اس منصب کے لئے ایک شائستہ ترین فرد کی تلاش کرنا تھا، جو عقلمندانہ تدبیر ،وسیع علم، عظیم روح اور پسندیدہ اخلاق سے اسلام کی ڈوبتی کشتی کو ساحل تک پھنچانے میں قیادت کے فرائض انجام دیتا۔

حادثہ سقیفہ کے مطالعہ وتجزیہ سے بخوبی پتا چلتا ھے کہ سقیفہ کے ھدایت کار اپنے اور اپنے منافع کے علاوہ کوئی اور فکر نھیں رکھتے تھے اور ھر شخص اپنا الو سیدھا کرنے کی فکر میں تھا۔

تاریخی المیہ!

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسد اطھر ابھی زمین پر تھا، بنی ھاشم اور آنحضرت کے بعض سچے اصحاب، پیغمبر اسلام کی تجھیز وتکفین کے مقدمات میں مصروف تھے کہ اچانک انصار کا گروہ پیغمبر اسلام کے گھر سے چند قدم کی دوری پر "سقیفہ بنی ساعدہ××" نام کے ایک سائبان کے نیچے جمع ھوا تا کہ پیغمبر اکرم کا خلیفہ وجانشین مقرر کرے۔ گویا ان لوگوں کی نظر میں خلیفہ کا تقرر پیغمبر اسلام کی تجھیز وتکفین وتدفین سے انتھائی فوری اور اھم مسئلہ تھا!۔

جس وقت حضرت علی علیہ السلام بنی ھاشم اور مھاجرین کے ایک گروہ کے ھمراہ گھر کے اندر

اوراس کے باھر پیغمبر اسلام کی نماز جنازہ اور تدفین کی تیاریوں میں مصروف تھے، اچانک حضرت عمر نے جو گھر کے باھر تھے، انصار کے سقیفہ میں جمع ھونے کی خبر سنی ۔کسی کے ذریعہ فوراً حضرت ابوبکر کو اطلاع دی کہ جتنی جلد ھو سکے گھر سے باھر آئے ۔حضرت ابوبکر حضرت عمر کے بلاوے کے سبب سے آگاہ نہ تھے اس لئے عذر خواھی کے ساتھ جواب دیا کہ: " میں یھاں پر کام میں مصروف ھوں لیکن آخر کار حضرت عمر کے اصرار پر مجبور ھوکر گھر اور پیغمبر کے جسد اطھر کو چھوڑ کر باھر آئے ۔جب وہ بھی حضرت عمر کی طرح ماجرا سے آگاہ ھوئے تو انھوں نے بھی سب کچھ چھوڑ کر سقیفہ کی راہ لی ۔دونوں سقیفہ کی طرف چلے اور ابوعبیدہ ابن جراح کو بھی اپنے ساتھ لئے گئے ۔اب ذرا غور سے طرفین کے مناظرہ اور استدلال کو سنیئے کہ یہ لوگ کس منطق کے تحت خود کو اور اپنے قبیلہ کو خلافت کے لئے دوسرے سے لائق وشائستہ سمجھتے تھے ۔

اس جلسہ میں انصار کے ترجمان سعد بن عبادہ اور حباب بن منذر تھے اور مھاجرین کی ترجمانی کا فریضہ ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ انجام دے رھے تھے، آخر میں انصار کی طرف سے بھی دو افراد نے سعد بن عبادہ کے کام میں روڑے اٹکانے کے لئے تقریریں کی ۔اب پورا قضیہ ملاحظہ ھو:

سعد (انصار سے مخاطب ھوکر): تم لوگ ایسی فضیلت اور برتری کے مالک ھو کہ دوسرے اس سے محروم ھیں، پیغمبر گرامی نے سالھا سال اپنے لوگوں کو توحید کی دعوت دی، لیکن چند لوگوں کے علاوہ کوئی آپ پر ایمان نہ لایا اور وہ بھی آپ کا دفاع کرنے کی طاقت نھیں رکھتے تھے ۔ لیکن تم لوگ انصار! آنحضرت پر ایمان لائے آنحضرت اور آپ کے اصحاب کا دفاع کیا ۔

آپ کے دشمنوں سے جنگ لڑی جس کے نتیجہ میں لوگوں نے آپ کا دین قبول کیا۔ یہ تم لوگوں کی تلواریں تھیں جس کی وجہ سے عرب آنحضرت کے سامنے ھتھیار ڈالنے پر مجبور ھوئے۔ جب پیغمبر اسلام اس دنیا سے رخصت ھوئے تو تم لوگوں سے راضی اور پر امید تھے اس لحاظ سے ضروری ھے کہ امر خلافت کی باگ ڈور اپنے ھاتھوں میں لے لو کیونکہ تم لوگ اس امر میں تمام لوگوں سے شائستہ اور بھتر ھو۔(46)

سعد کی منطق یہ تھی، چونکہ ھم نے پیغمبر اور آپ کے اصحاب کو پناہ دی ھے، آپ اور آپ کے اصحاب کا دفاع کیا ھے اور آپ کے دشمنوں سے جنگ لڑی ھے اس لئے ھم قیادت کی باگ ڈور اپنے ھاتھوں میں لینے میں دوسروں سے سزاوار اور لائق ھیں۔

اب دیکھئے کہ اس کے مقابلے میں مھاجرین کی منطق کیا تھی؟

حضرت ابوبکر: مھاجرین اولین گروہ ھیں جو دین پیغمبر پر ایمان لائے اور اس فضیلت پر افتخار کرتے ھیں۔ انھوں نے مشکلات اور سختیوں میں صبر وتحمل سے کام لیا ھے، افراد کی کمی پر نھیں ڈرے ھیں، دشمنوں کی اذیتوں کو برداشت کیا ھے اور آنحضرت پر ایمان اور آپ کے دین سے منہ نھیں موڑا۔ ھم، آپ، انصار کے فضائل اور خدمات سے ھرگز انکار نھیں کرتے اور بے شک مھاجرین کے بعد دیگر لوگوں پر آپ فضیلت اور برتری رکھتے ھیں۔ اس لئے قیادت ورھبری کی باگ ڈور مھاجرین کے ھاتہ اور وزارت آپ لوگوں کے ھاتہ میں ھوگی اور ھم حاکم ھوں گے اور آپ وزیر اور کوئی بھی کام آپ لوگوں کے مشورہ کے بغیر انجام نھیں پائے گا(47)

مھاجرین کی برتری کا استدلال یہ تھا کہ وہ سب سے پھلے پیغمبر پر ایمان لائے ھیں اورآپ کے دین کوقبول کیا ھے۔

حباب بن منذر : اے جماعت انصار ! حکومت کی باگ ڈور کو اپنے ھاتہ میں لے لو۔ دوسرے لوگ تمھاری ھی قدرت کے سائے میں زندگی بسر کرتے ھیں اور کوئی تمھارے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نھیں کرسکتا تم لوگ صاحب قدرت ھواور تعداد میں بھی زیادہ ھو۔اپنی صفوں میں ھرگز اختلاف وتفرقہ پیدا نہ ھونے دو، اختلاف کی صورت میں تباھی اور بردباری کے سوا کوئی نتیجہ نہ ھوگا۔اگرمھاجرین نے اقتدار پر قبضہ کرنے پر اصرار کیا توھم مسئلہ کو" دوامیر" کے طریقے سے حل کریں گےاورایک قائداور حاکم ھم میں سے اورایک حاکم ان میں سے مقرر ھوگا(48)

اس مناظرہ میں انصار کی منطق افراد کی کثرت اوران کے دھڑے کی طاقت پر منحصر ھے۔وہ کھتے ھیں چونکہ ھم طاقتور ھیں اس لئے حاکم ھم میں سے ھونا چاھئے۔

حضرت عمر: ایک غلاف میں ھرگز دوتلواریں نھیں سما سکتی ھیں۔خدا کی قسم عرب تم لوگوں کی فرمانروائی کے سامنے ھرگز تسلیم نھیں ھوں گے کیونکہ ان کا پیغمبر آپ لوگوں میں سے نھیں ھے۔لیکن اگر حکومت پیغمبر کے کسی رشتہ دار کے ھاتہ آئے توعرب کواس پر اعتراض نھیں ھوگا ۔کس کی جرأت ھے کہ اس حکومت کے بارے میں ھمارا مقابلہ کرے اورھم سے لڑے جس کی داغ بیل حضرت محمد نے ڈالی ھے، جب کہ ھم آپ کے رشتہ دار ھیں۔

اس گفتگو میں حضرت عمر نے زمام حکومت کو ھاتہ میں لینے کا معیار پیغمبر کے ساتھ اپنی رشتہ

داری اور قرابت کو قرار دیا اور اس طرح مهاجر اور ان میں قبیله قریش کو خلافت کے لئے شائسته وحقدار جتلایا هے(49)۔

"حباب بن منذر" نے ایک بار پھر انصار کی طاقت کا سهارا لیتے هوئے کها:

اے انصار کی جماعت! عمر اور اس کے هم فکروں کی بات پر کان نه دهرو وه تم لوگوں سے قیادت اور فرمان روائی چھیننا چاهتے هیں۔ اگر انهوں نے هماری بات نه مانی تو ان سب کو اس سرزمین سے نکال باهر کرو تم لوگ اس کام (فرمانروائی) کے لئے دوسرے لوگوں سے زیاده شائسته هو۔ تم هی لوگوں کی تلواروں کی جھنکار کے نتیجه میں لوگوں نے یه دین قبول کیا هے۔

عمر: خدا تجھے موت دے

حباب: خدا تجھے موت دے۔

ابوعبیده نے گویا انصار کو ایک رشوت دیتے هوئے مهاجرین کو حکومت دیئے جانے کی یوں تائید کی:

اے انصار کی جماعت! تم لوگ وه پهلے افراد تھے جنهوں نے پیغمبر اسلام کی حمایت اور مدد کی اب یه هرگز سزاوار نهیں هے که تم هی لوگ سب سے پهلے پیغمبر کی سنت کو بھی بدل دو۔

یهاں پر انصار میں سے سعد بن عباده (جو خلافت کے لئے انصار میں سے تقریباً آدھے لوگوں کا امیدوار تھا) کا چچیرا بھائی بشیر بن سعد، اٹھ کھڑا هوا، امید تھی وه انصار کے حق میں بول کر قضیه کو ختم کردے گا لیکن اس نے اس کے برخلاف، سعد بن عباده کے ساتھ اپنی دیرینه

عداوت کی وجہ سے حضرت عمر کے استدالال کی تائید کی اور اپنے رشتہ داروں کی طرف مڑ کر کھا:

محمد قریش میں سے ھیں اور آپ کے رشتہ دار خلافت کے لئے دوسروں سے اولیٰ اور شائستہ ھیں ، میں یہ ھرگز نھیں دیکھنا چاھتا کہ آپ لوگ اس مسئلے میں ان سے ٹکرائیں طرفین نے اپنی اپنی بات سنادی اور کوئی دوسرے کو مطمئن نہ کرسکا تو حضرت ابوبکر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ھوئے ایک تجربہ کار سیاستداں کی طرح ایک نئی تجویز پیش کی اور ایک قدم آگے بڑھاتے ھوئے یہ فیصلہ کیا کہ دو آدمیوں کو پیش کرے تا کہ لوگ ان دونوں میں سے ایک کی بیعت کرلیں ،خاص کر انھوں نے مشاھدہ کیا کہ انصار میں اتفاق رائے نھیں ھے اور بشیر بن سعد،سعد بن عبادہ (قبیلہ خزرج کے سردار) کا مخالف ھے۔

اس لئے ایک خاص انداز میں بحث ومباحثہ کو ختم کرتے ھوئے بولے:

"میری درخواست ھے کہ مھربانی کر کے اختلاف وتفرقہ سے پرھیز کیجئے میں آپ لوگوں کا خیر خواہ ھوں،بھتر ھے بات کو مختصر کیجئے اور عمر وابوعبیدہ میں سے کسی ایک کی بیعت کر لیجئے"

عمر وابوعبیدہ دونوں نے کھا:

ھمارے لئے ھرگز یہ مناسب نھیں ھے کہ آپ جیسی شخصیت کے ھوئے ھوئے حکومت و خلافت کی باگ ڈور ھم اپنے ھاتہ میں لے لیں۔مھاجرین میں سے کوئی بھی آپ کے برابر نھیں ھے۔آپ غار ثور میں پیغمبر کے ھمنشین تھے،آپ نے پیغمبر کی جگہ پر نماز پڑھائی ھے اور آپ کی مالی حالت بھی بھتر ھے ، اپنے ھاتہ کو آگے بڑھائے تا کہ ھم آپ کی بیعت

کریں۔

یھاں پرحضرت ابوبکر نے بلاکسی تکلف کے بغیر کچھ کھے اپنا ھاتہ پھیلا دیا اور دل میں موجود راز سے پردہ اٹھا دیا، اور یہ بات کھل گئی کہ عمر اور ابوعبیدہ کو آگے بڑھانے کا مقصد اپنے لئے راہ ھموار کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔

لیکن اس سے پھلے کہ عمر، ابوبکر کے ھاتہ پر بیعت کرے، بشیر بن سعد نے سبقت کی اور حضرت ابوبکر کے ھاتہ پر دوسروں سے پھلے بیعت کی۔ اس کے بعد عمر اور ابوعبیدہ نے بھی جانشین رسول کی حیثیت سے حضرت ابوبکر کی بیعت کی۔ اسی وقت گروہ انصار میں وہ گھری دراڑ پڑگئی جس کا امکان بشیر کی تقریر کے بعد پیدا ھوچکا تھا۔ اس طرح انصار کی ناکامی قطعی ھوگئی۔

حباب بن منذر، بشیر کی بیعت (جو خود انصار میں سے تھا) پر آگ بگولا ھوگیا اور فریاد بلند کرتے ھوئے بولا: بشیر! تم نے نمک حرامی کی اور اپنے چچیرے بھائی سے رشک کی بنا پر اسے حاکم بننے نھیں دیا۔

بشیر نے کھا:

ھرگز ایسا نھیں ھے بلکہ میں یہ نھیں چاھتا تھا کہ خدا نے جو حق گروہ مھاجر کے لئے مخصوص کیا تھا، اس پر جھگڑا برپا کروں۔

"اسید بن حضیر" قبیلہ اوس کا سردار جس کے دل میں ابھی بھی خزرج کے سردار کی طرف سے کینہ تھا اٹھا اور اپنے قبیلہ سے مخاطب ھوکر بولا:

اٹھواوراابوبکر کی بیعت کرو، کیونکہ اگر سعد حکومت کی باگ ڈوراپنے ھاتہ میں لے لے گا تو قبیلہ خزرج ھم پرایک قسم کی برتری پیدا کرلے گا اس پر قبیلہ اوس نے بھی اپنے سردار کے حکم سے حضرت ابوبکر کی بیعت کرلی۔

اس موقع پر سیدھے سادھے لوگوں کی جماعت جن میں فکری شعور نھیں پایا جاتا اور جو اپنے سردار کے حکم کی پیروی کرتے ھوئے حضرت ابوبکر کی بیعت کے لئے اس طرح آگے بڑھے کہ سعد قدموں تلے روندڈالا گیا۔

ایک نامعلوم شخص نے پکارتے ھوئے کھا:

خزرج کا سردار پیروں تلے روندڈالا گیا! اس کا خیال کرو!

لیکن حضرت عمراس بے احترامی سے خوش ھوئے اور کھا:

خدااسے موت دے، کیونکہ ھمارے لئے ابوبکر کی بیعت سے بالاتر کوئی چیز نھیں ھے!

خودحضرت عمر جب بعد میں سقیفہ کا ماجرا بیان کرتے تھےتو حضرت ابوبکر کے حق میں اپنی بیعت کی وضاحت یوں کرتے تھے:

اگرھم اس دن نتیجہ حاصل کئے بغیر جلسہ کوترک دیتے تو ممکن تھا ھمارے چلے جانے کے بعد انصارا تفاق رائے پیدا کرلیتے اوراپنے لئے کسی قائد کاانتخاب کرلیتے۔

بالآخر سقیفہ کا جلسہ بیان شدہ صورت میں خلافت کے لئے حضرت ابوبکر کے انتخاب کے اوپر ختم ھوااور حضرت ابوبکر مسجد رسول کی طرف بڑھے جبکہ حضرت عمر، ابوعبیدہ اورقبیلہ اوس کا ایک گروہ انھیں اپنے درمیان میں لئے ھوئے تھا اور سعد بھی اپنے تمام ساتھیوں کے ھمراہ

اپنے گھر کی طرف روانہ ھوگیا(50)

بارھویں فصل

انصار اور مہاجرین کی منطق کیا تھی؟

سقیفہ کے واقعہ کے بغور مطالعہ کے بعداب مناسب ھے کہ اس کے قابل توجہ نکات اور اسے وجود میں لانے والوں کی منطق پر غور کیا جائے ۔اس ”جلسہ“ کے قابل توجہ نکات کا خلاصہ ذیل کے چند امور میں کیا جا سکتا ھے:

1۔قرآن مجید کا حکم ھے کہ مؤمن آپس میں جمع ھوکر اپنے مشکلات کی گتھیوں کو تبادلہ خیال کے ذریعہ سلجھائیں۔اس کے اس گراں بھا حکم کا مقصد یہ ھے کہ عقلمند اور حق پسند لوگوں کی ایک جماعت ایک پرسکون جگہ پر جمع ھوں اور حقیقت پسندانہ نیز تعصب سے عاری غور وفکر کے ذریعہ زندگی کی راہ کو روشن کریں اور مسائل کو حل کریں۔

کیا سقیفہ کے جلسہ میں ایسا رنگ ڈھنگ پایا جاتا تھا؟ اور کیا حقیقت میں اسلامی معاشرے کے عقلا وھاں پر جمع ھوئے تھے کہ خلافت کی گتھی کو گفتگو کے ذریعہ حل کریں؟ یا مطلب اس کے بالکل برعکس تھا؟

اس جلسہ میں مھاجرین میں سے صرف تین افراد حاضر تھے اور ان تین افراد نے دیگر مھاجرین کو اس امر سے مطلع نھیں کیا تھا کہ وہ یہ کام انجام دینے جارھے ھیں۔کیا ایسے جلسہ کو جس میں عالم اسلام کی عظیم شخصیتیں ، جیسے علی (ع) ابن ابیطالب ،سلمان فارسی ، ابوذر غفاری ،مقداد ،حذیفہ ،ابی بن کعب ،طلحہ وزبیر اوران جیسی دسیوں شخصیتیں موجود نہ ھوں عالم اسلام کے لئے صلاح ومشورہ اورتبادلہ خیا کا جلسہ کھا جا سکتا ھے؟

کیا یہ صحیح تھا کہ ایک ایسے اھم موضوع کے لئے ایک چھوٹی سی میٹینگ پر اکتفا کی جاتی جس میں چیخ و پکار اور داد وفریاد بلند کی گئی اور انصار کے امیدوار کو قدموں تلے کچل ڈالا گیا؟! یا یہ کہ

ایسے اھم موضوع کے بارے میں کئی جلسے منعقد کرنا ضروری تھا جن میں عالم اسلام کی اھم مدبر اور شائستہ شخصیتیں بیٹھ کر اس اھم مسئلہ پر صلاح مشورہ کریں اور بالآخر اتفاق نظر یا اکثریت آراء سے مسلمانوں کا خلیفہ منتخب کیا جاتا؟

اس جلد بازی کے ساتھ حضرت ابوبکر کو خلافت کے لئے منتخب کرنا اس قدر ناپختہ اور خلاف اصول تھا کہ، بعد میں خود حضرت عمر اس سلسلے میں کھتے تھے:

"کانت بیعۃ ابی فلتۃ وقی اللہ شرّھا فمن دعاکم الی مثلھا فاقتلوہ" (51)

"یعنی خلافت کے لئے ابوبکر کا انتخاب ایک اتفاق سے زیادہ نھیں تھا اور یہ کام صلاح ومشورہ اورتبادلہ خیال کی بنیاد پر انجام نھیں پایا، اب جو کوئی بھی تم لوگوں کو ایسے کام کی دعوت دے، اسے قتل کرڈالو"

2۔ دوسرا قابل توجہ نکتہ خود اھل سقیفہ کی منطق ھے۔

گروہ مھاجر کا استدلال غالباً دو چیزوں کے گرد گھوم رھا تھا: ایک ان کا خدا و پیغمبر اسلام پر ایمان لانے میں پیش قدم ھونا اور دوسرا پیغمبر اسلام سے ان کی قرابت ورشتہ داری! اگر ان کی برتری کا معیار یھی دو چیزیں تھیں تو خلافت کے لئے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر وابوعبیدہ کا ھی سھارا نھیں لینا چاھئے تھا، کیونکہ مدینہ میں اس وقت ایسے افراد بھی موجود تھے جو ان دو افراد سے بھت پھلے دین اور توحید پر ایمان لا چکے تھے اور پیغمبر اسلام سے نزدیکی قرابت بھی رکھتے تھے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے

پھلے شخص تھے اور پیدائش کے دن سے ھی آپ کے دامن مبارک میں تربیت پائے ھوئے تھے اور رشتہ داری کے لحاظ سے بھی آپ کے چچیرے بھائی اور داماد تھے۔اس کے باوجود کس طرح ان تین افراد نے خلافت کی گیند کو ایک دوسرے کی طرف پاس دیتے ھوئے بالآخر اسے حضرت ابو بکر کے حوالے کر دیا؟! عمر نے ابو بکر کی برتری کی توجیہ ان کی دولت مندی، غار ثور میں رسول اللہ کی همراهی، اور پیغمبر کی جگہ پر نماز پڑھنے کے ذریعھکی۔

دولت مند ھونے کے بارے میں کیا کھا جائے، یہ وھی ایام جاھلیت کی منطق ھے جب دولت اور ثروت کو برتی وفضیلت کا سبب جانتے تھے۔مشرکین کا ایک اعتراض یھی تھا کہ یہ قرآن مجید کیوں ایک دولتمند فرد پر نازل نھیں ھوا(52)

اگر رسول خدا کے ساتھ غار ثور میں ھمسفر ھونا خلافت کے لئے شائستگی اور معیار ھوسکتا ھے تو امیر المؤمنین (ع) کو خلافت کے لئے اس سے بھی زیادہ شائستہ وحقدار ھونا چاھئے۔کیونکہ آپ (ع) شب ھجرت اپنی جان پر کھیل کر پیغمبر اسلام کے بستره پر سوئے تھے مفسرین کا اتفاق ھے کہ درج ذیل آیت آپ (ع) کے بارے میں نازل ھوئی ھے:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَشْرِی نَفْسَہ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ)

اور لوگوں میں وہ بھی ھیں جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لئے بیچ ڈالتے ھیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مھربان ھے۔(53)

آنحضرت کی بیماری کے دوران پیغمبر کی جگہ حضرت ابو بکر کا نماز پڑھانا، بذات خود ایک نامشخص اور مبھم داستان ھے اور یہ بات ثابت ھی نھیں کہ وہ نماز پڑھانے میں کامیاب بھی

ھوئے کہ نھیں؟اور یہ کام پیغمبر کی اجازت سے انجام پایا تھا یا ایک من مانی حرکت تھی اور پیغمبر کی بعض بیویوں کے اشارہ پر نماز میں پیغمبر کی جانشینی پر قبضہ کرنے کی کوشش تھی؟! (اس بحث کی تفصیل آیندہ فصلوں میں ملاحظہ فرمائیں)

بھر حال اگریھی امر امامت اسلامیہ کی خلافت کی شائستگی کے لئے دلیل ھو، تو پیغمبر بارھا مسافرت کے وقت اپنی جانشینی کی ذمہ داری من جملہ نماز کی امامت بعض افراد کو سونپتے رھے ھیں۔ ایسے افراد کا سراغ حیات پیغمبر کی تاریخ میں ملتا ھے، یہ کیسے ممکن ھے کہ ان سب جانشینوں میں سے صرف ایک آدمی، وہ بھی صرف ایک نماز پڑھانے کی وجہ سے باقی لوگوں پر پیغمبر کی جانشینی کا حقدار بن جائے؟

3۔شریعت کے اصول وفروع کا علم رکھنا، اسلامی معاشرے کی تمام ضرورتوں سے باخبر ھونا اور گناہ وخطا سے پاک ھونا، امامت ورسول خدا کی جانشینی کی دو بنیادی شرطیں ھیں، جبکہ سقیفہ کے جلسہ میں اگر کسی چیز پر گفتگو نھیں ھوئی تو وہ یھی دو موضوع تھے۔

کیا یہ مناسب نھیں تھا کہ یہ لوگ قومیت، رشتہ داری اور دیگر بیھودہ معیاروں پر انحصار کرنے کے بجائے علم و دانش اور عصمت اور پاک دامنی کے موضوع کو معیار قرار دے کر اصحاب پیغمبر میں سے امت کی زعامت کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتے جو دین کے اصول و فروع سے بخوبی واقف ھو اور ابتدائے زندگی سے اس لمحہ تک اس سے کوئی غلطی سرزد نہ ھوئی ھو؟ اس طرح خودخواھی کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کو مدنظر رکھا جاتا؟

4۔ان دونوں گروھوں کے استدال کے طریقے سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ لوگ پیغمبر کی خلافت و

جانشینی سے ظاھری حکومت اور لوگوں پر فرماں روائی کے علاوہ کوئی اور مقصد نھیں رکھتے تھے۔انھوں نے پیغمبر اسلام کے دیگر منصبوں سے چشم پوشی کر رکھی تھی اور ان کی طرف کوئی توجہ نھیں رکھتے تھے۔یھی وجہ تھی کہ انصار، افراد کی کثرت اور اپنے قبیلہ کی طاقت پر ناز کرتے ھوئے اپنے کو دوسروں پر فضیلت دیتے اور حقدار سمجھتے تھے۔

یہ صحیح ھے کہ پیغمبر اسلام مسلمانوں کے حاکم اور فرماں روا تھے،لیکن آپ اس مقام ومنزلت کے علاوہ کچھ دوسرے فضائل اور منصبوں کے بھی مالک تھے کہ مھاجر وانصار کے امیدوارں میں ان کا شائبہ تک نھیں ملتا تھا۔پیغمبر اسلام شریعت کی تشریح کرنے والے، اصول وفروع کو بیان کرنے والے، اور گناہ ولغزش کے مقابلے میں معصوم تھے۔ان افراد نے پیغمبر کی جانشینی کا انتخاب کرتے وقت پیغمبر اسلام کی ان معنوی فضیلتوں کو کیسے نظر انداز کر دیا جن کی وجہ سے آپ اسلامی معاشرہ میں برتر اور حکمراں قرار پائے تھے بلکہ اسے ظاھری وسیاسی حکومت کے زاویہ سے دیکھا جو عموماً دولت،قدرت اور قبائلی قرابت کی بنیادوں پر قائم ھوتی ھے۔

اس غفلت یا تغافل کی وجہ واضح ھے، کیونکہ اگر اسلامی خلافت کو اس زاویہ سے دیکھتے تو انھیں اپنے آپ کو خلافت سے محروم کرنے کے سوا کوئی نتیجہ نھیں ملتا۔اس لئے کہ دین کے اصول و فروع سے ان کی آگاھی بھت محدود تھی، حتی حضرت ابوبکر کا مجوزہ امیدوار (حضرت عمر) سقیفہ کی میٹینگ سے تھوڑی ھی دیر پھلے پیغمبر اسلام کی وفات کا منکر ھو چکا تھا اور اپنے ایک دوست کی زبانی قرآن مجید کی آیت # 1 سننے کے بعد خاموش ھوا تھا۔اس کے علاوہ حکمرانی کے دوران اور اس سے پھلے بھی ان لوگوں کی بے شمار غلطیاں اور خطائیں کسی سے پوشیدہ نھیں

هیں ۔ان حالات کے پیش نظر کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈال سکیں جس کی بنیاد علم ودانش،تقویٰ و پرهیز گاری،معنوی کمالات اورعصمت پر مستحکم هو؟!

اصحاب سقیفه کی منطق پر امیر المؤمنین کا تجزیه

امیر المؤمنین علیہ السلام نے سقیفہ میں موجود مهاجرین وانصار کی منطق پر یوں تنقید فرمائی:

جب ایک شخص نے امام (ع) کی خدمت میں آکر سقیفہ کا ماجرا بیان کیا کہ:مهاجر وانصار کے دوگروہ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھ رهے تھے تو علی علیہ السلام نے فرمایا:

1۔(وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ)(آل عمران 144)

"تم نے انصار کو جواب کیوں نہ دیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے هم سے کها هے کہ هم ان کے نیک افراد کے ساتھ نیکی کریں اوران کے خطا کاروں کی تقصیر معاف کردیں"۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے پوچھا:قریش کس اصول پر اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے؟اس شخص نے جواب دیا:وہ کهتے تھے همارا تعلق رسول خدا کے خاندان سے هے اور همارا اور آپ کا قبیلہ ایک هی هے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:انهوں نے درخت سے اپنے لئے استدلال کیا اوراس کے پھل اور میوہ کو ضایع و برباد کردیا۔اگر وہ اسی لحاظ سے خلافت کے حقدار هیں تو وہ ایک درخت کی ٹهنیاں هیں اور میں اس درخت کا پھل اور آنحضرت کا چچیرا بھائی هوں ، پھر خلا

فت کا حقدار میں کیوں نھیں ھوں (54)

امیر المؤمنین کی خلافت کے لئے خود شائستہ ھونے کی منطق

سقیفہ کا ماجرا انتھائی نا گفتہ بہ حالت میں اختتام کو پھنچا اور حضرت ابو بکر ایک فاتح کی حیثیت سے جلسہ سے باھر نکلے، کچھ لوگ انھیں اپنے گھیرے میں لئے ھوئے تھے اور لوگوں سے کھتے تھے: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ کی بیعت کرو اور بیعت کو عمومی بنانے کے لئے لوگوں کے ھاتھ پکڑ پکڑ کر حضرت ابو بکر کے ھاتھ پر رکھتے تھے۔

ان نا گفتہ بہ حوادث کے تحت کہ یھاں پر ھم ان کی وضاحت کرنے سے قاصر ھیں، حضرت علی کو مسجد میں لا یا گیا تا کہ وہ بھی بیعت کریں۔

امام علیہ السلام نے خلافت کے لئے اپنی شائستگی اور سنت رسول سے متعلق اپنے وسیع علم اور عدالت کی بنیادوں پر حکومت کرنے کی اپنی روحی توانائی و صلاحیت کے ذریعہ خلافت کے لئے اپنی لیاقت و شائستگی پر استدلال کرتے ھوئے فرمایا:

"اے گروہ مھاجر! جس حکومت کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنیاد ڈالی ھے، اسے آنحضرت کے خاندان سے خارج کر کے اپنے گھروں میں نہ لے جاؤ۔ خدا کی قسم ھم اھل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے زیادہ حقدار ھیں۔ ھمارے درمیان ایسے افراد موجود ھیں جو قرآن مجید کے مفاھیم کا مکمل علم رکھتے ھیں۔ دین کے اصول اور فروع کو اچھی طرح جانتے ھیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے اچھی طرح آگاہ ھیں، اور اسلامی

سماج کو بخوبی ادارہ کر سکتے هیں ۔ برائیوں کی روک تھام کر سکتے هیں اور غنائم کو عادلانہ تقسیم کر سکتے هیں ۔

جب تک معاشرے میں ایسے افراد موجود هیں دوسروں کی باری نهیں آتی ، ایسا شخص خاندان نبوت سے باهر کهیں نهیں مل سکتا۔ خبر دار! هویٰ وهوس کے غلام نہ بنو کیونکہ اس طرح راہ خدا سے بھٹک جاؤ گے اور حق وحقیقت سے دور هو جاؤ گے!(55)

شیعہ روایات کے مطابق ، امیر المؤمنین بنی هاشم کے ایک گروہ کے همراہ حضرت ابو بکر کے پاس گئے اور خلافت کے لئے مذکورہ صورت میں قرآن وسنت سے متعلق اپنے علم ، اسلام میں سبقت اور جهاد میں ثابت قدمی ، بیان میں فصاحت و بلاغت ، شهامت اور شجاعت کو دلائل کے طور پر پیش کر کے اپنی شائستگی کو ثابت کیا اور فرمایا:

”میں پیغمبر اسلام کی حیات اور آپ کی وفات کے بعد منصب خلافت کا مستحق اور سزاوار هوں ، میں اسرار کا خزانہ اور علوم کا مخزن هوں ۔ میں صدیق اکبر اور فاروق اعظم هوں ۔

میں پهلا شخص هوں جو پیغمبر پر ایمان لایا اس راہ میں آپ کی تصدیق کی ۔ میں مشرکین کے ساتھ جنگ وجهاد کے دوران سب سے زیادہ ثابت قدم ، کتاب وسنت کے علم سے سب سے زیادہ آگاہ ، دین کے اصول وفروع سے سب سے زیادہ واقف ، بیان میں سب سے زیادہ فصیح اور ناخوشگوار حالات میں سب سے زیادقوی اور بهادر فرد هوں ، تم لوگ اس وراثت میں میرے ساتھ جنگ وجدال پر کیوں اتر آئے هو۔(56)

اسی طرح امیر المؤمنین اپنے ایک خطبہ میں خلافت کا حقدار ایسے شخص کو سمجھتے هیں جو امت

میں حکومت چلانے کے لئے سب سے بھادر حکم الھی کو سب سے زیادہ جاننے والا ھو:

"ایھا الناس انّ احق الناس بھذا الامر اقواھم علیہ و اعلمھم بامر اللہ فیہ فان شغب شاغب استعتب فان بی قوتل" (57)

یعنی اے لوگو! حکومت کے لئے سب سے شائستہ فرد وہ ھے جو، سماج کا نظام چلانے میں سب سے زیادہ طاقت ور اور حکم الھی کو جاننے میں سب سے زیادہ عالم ھو۔ اگر کوئی شخص فساد کو ھوا دے اور وہ حق کے سامنے تسلیم نہ ھو تو اس کی تنبیہ کی جائے گی اور اگر اپنی غلطی کو جاری رکھے تو قتل کیا جائے گا۔۔

یہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی منطق نھیں ھے بلکہ آپ (ع) کے بعض مخالفین بھی جب بیدار ضمیر کے ساتھ بات کرتے ھیں تو خلافت کے لئے حضرت علی (ع) کی شائستگی کا اعتراف کرتے ھیں کہ آپ کا حق چھین لیا گیا۔

جب ابوعبیدہ جراح حضرت ابوبکر کی بیعت سے حضرت علی علیہ السلام کے انکار کے بارے میں آگاہ ھوئے تو امام علیہ السلام کی طرف رخ کرکے بولے:

" حکمرانی کو ابوبکر کے لئے چھوڑ دیجئے، اگر آپ زندہ رھے اور طولانی عمر آپ کو نصیب ھوئی تو آپ حکمرانی کے لئے سب سے شائستہ ھیں کیونکہ آپ کی فضیلت، قوی ایمان، وسیع علم، حقیقت پسندی، اسلام قبول کرنے میں پیش قدمی اور پیغمبر اسلام کے ساتھ آپ کی قرابت کسی سے پوشیدہ نھیں ھے (58)

تیرھویں فصل

نماز کی امامت، خلافت کے لئے دلیل نہیں!

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت کی قیادت کا موضوع گزشتہ چودہ صدیوں سے

عقائد اور مذاھب کے علماء اور دانشوروں کے درمیان مسلسل مورد بحث قرار پا تا رھا ھے، لیکن آج تک ایک محقق بھی ایسا پیدا نھیں ھوا جو یہ توجیہ کرے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت پیغمبر اسلام کی نص کے مطابق عمل میں آئی ھے اور یہ کھے کہ پیغمبر خدا صلی اللہعلیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں اپنی حیات میں لوگوں کو وصیت کی تھی۔

حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں سنی علماء کے تمام دلائل مھاجرین وانصار کی بیعت اور خلافت پر اتفاق نظر تک محدود ھیں اور یہ امر کہ حضرت ابوبکر کی خلافت پیغمبر اکرم کی نص کے مطابق نھیں تھی، یہ بات خود سقیفہ میں حضرت ابوبکر اور ان کے ھمفکروں کے بیانات سے بالکل ظاھر اور واضح ھوجاتی ھے۔ اگر حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں پیغمبر کی طرف سے کوئی نص موجود ھوتی تو وہ خود سقیفہ میں حضرت عمر اور ابوعبیدہ کا ھاتھ پکڑ کر ھر گز یہ نہ کھتے کہ: " قد رضیت لکم ھذین الرجلین" میں ان دو افراد کو خلافت کے لئے صالح اور شائستہ جانتا ھوں اور ان دونوں کے انتخاب پر راضی ھوں۔

اس کے علاوہ اگر حضرت ابوبکر کی خلافت کے سلسلے میں کوئی الھی نص موجود ھوتی، تو سقیفہ میں قریش کی پیغمبر اسلام صلی اللہعلیہ وآلہ وسلم سے قرابت اور ان کی اسلام میں سبقت کے ذریعہ استدلال نھیں کیا جاتا اور ان کے دوست وھم فکر کبھی حضرت ابوبکر کے پیغمبر کے ساتھ غار ثور میں ھم سفر ھونے اور نماز میں پیغمبر کی جانشینی جیسے مسائل سے اپنے استدلال کو تقویت نہ بخشتے۔

خود حضرت ابوبکر نے سقیفہ کے دن انصار کے امیدوار کی تنقید کرتے ھوئے کھا:

"ان العرب لا تعرف ھذا الامر الّا القریش اوسط العرب داراً و نسباً"

،عرب معاشرہ قریش کے علاوہ جوحسب ونسب کے لحاظ سے دوسروں پر برتری رکھتے ھیں کسی کوخلافت کے لئے شائستہ نھیں جانتا۔

اگرحضرت ابوبکر کی خلافت کے حق میں رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک لفظ بھی بیان ھوا ھوتا توان کمزوردلائل سے استدلال کرنے کے بجائے اس کا سھارالیکرخود حضرت ابوبکر کھتے: اے لوگو! پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فلاں سال اورفلاں روز مجھے مسلمانوں کے پیشوااورخلیفہ کے طور پر منتخب کیا ھے۔

یہ کیسے کھا جاسکتا کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کوپیغمبر نے معین فرمایا ھے جب کہ وہ خود بیماری کی حالت میں تمنا کرتے تھے، کہ کاش میں نے پیغمبر اسلام سے یہ پوچھ لیا ھوتا کہ "امت کی قیادت" کا حقدارکون ھے؟

عالم اسلام کے مشھورمؤرخ ،طبری اس واقعہ کوتفصیل سے بیان کرتے ھوئے لکھتے ھیں:

" جب ابوبکر بیمارھوئے اورقریش کا ایک معروف سرمایہ دارعبدالرحمان بن عوف ان کی عیادت کیلئے آیا تومقدماتی گفتگو کے بعدابوبکر نے انتھائی افسوس کے ساتھ لوگوں کی طرف رخ کرکے کھا:

میری تکلیف کی پھلی وجہ وہ تین چیزیں ھیں جن کومیں نے انجام دیا ھے،کاش میں نے انھیں انجام نہ دیا ھوتا!اورتین چیزیں اورھیں کہ کاش میں نے ان کے بارے میں پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا ھوتا۔

وہ تین چیزیں جنھیں کاش میں نے انجام نہ دیا ہوتا حسب ذیل ہیں:

1۔کاش فاطمہ کا گھر نہ کھلوایا ہوتا چاہے جنگ وجدال کی نوبت آجاتی۔

2۔کاش میں نے سقیفہ کے دن خلافت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہ لی ہوتی اوراسے عمر یا ابوعبیدہ کے سپرد کرکے خودوزیرو مشیر کے عہدہ پر رہتا۔

3۔کاش ایاس بن عبداللہ کو جوراہزنی کرتا تھا، آگ میں جلانے کے بجائے تلوار سے قتل کرتا۔

اوروہ تین چیزیں جن کے بارے میں کاش میں نے پیغمبراکرم سے پوچھ لیا ہوتا یہ ہیں:

1۔کاش میں نے پوچھ لیا ہوتا کہ خلافت وقیادت کا حقدار کون ہے؟ اورخلافت کا لباس کس کے بدن کے مطابق ہے؟

2۔کاش میں سوال کرلیا ہوتا کہ کیااس سلسلے میں انصار کا کوئی حق بنتا ہے؟

3 کاش میں نے پھوپھی اوربھن کی بیٹی کی میراث کے بارے میں پیغمبراسلام سے دریافت کرلیا ہوتا!(59)

نماز میں حضرت ابوبکر کی جانشینی

اہل سنت کے بعض علماء اوردانشوروں نے پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری کے دوران نماز میں حضرت ابوبکر کی جانشینی کے موضوع کو بڑی شدومد سے نقل کیا ہے اوراسے ایک بڑی فضیلت یا خلافت کے لئے سند شمار کرکے یہ کہنا چاہا کہ جب پیغمبر نماز میں ان کی

جانشینی پر راضی ھوں تو لوگوں کو ان کی خلافت اور حکمرانی پر اور بھی زیادہ راضی ھونا چاھئے جو ایک دنیوی امر ھے۔

جواب: یہ استدلال کئی جھتوں سے قابل رد ھے:

1۔ تاریخی لحاظ سے کسی بھی صورت میں ثابت نھیں ھے کہ نماز میں حضرت ابوبکر کی جانشینی پیغمبر کی اجازت سے انجام پائی ھو۔ بعید نھیں ھے کہ انھوں نے خود یا کسی کے اشارہ پر یہ کام انجام دیا ھو۔ اس امر کی تائید اس واقعہ سے ھوتی ھے کہ حضرت ابوبکر نے ایک بار اور پیغمبر کی اجازت کے بغیر آپ کی جگہ کھڑے ھوکر نماز کی امامت خود شروع کردی تھی۔

اھل سنت کے مشھور محدث امام بخاری اپنی صحیح میں نقل کرتے ھیں: ایک دن پیغمبر قبیلہ بنی عمرو بن عوف کی طرف گئے تھے۔ نماز کا وقت ھوگیا ابوبکر پیغمبر کی جگہ پر کھڑے ھوگئے اور نماز کی امامت شروع کردی جب پیغمبر مسجد میں پھنچے اور دیکھا کہ نماز شروع ھوچکی ھے تو نماز کی صفوں کو چیرتے ھوئے محراب تک پھنچ گئے اور نماز کی امامت خود سنبھال لی اور ابوبکر پیچھے ھٹ کر بعد والی صف میں کھڑے ھوئے۔(60)

2۔ اگر ھم فرض کرلیں کہ حضرت ابوبکر نے پیغمبر کے حکم سے آپ کی جگہ پر نماز پڑھائی ھوگی تو نماز میں امامت کرنا ھرگز حکومت اور خلافت جیسی انتھائی اھم ذمہ داری کی صلاحیت کے لئے دلیل نھیں بن سکتا۔

نماز کی امامت کے لئے قرائت کے صحیح ھونے اور احکام نماز جاننے کے علاوہ کوئی اور چیز معتبر نھیں ھے (اور اھل سنت علماء کی نظر میں عدالت تک کی شرط نھیں ھے) لیکن خلافت

اسلامیہ کے حاکم کے لئے سنگین شرائط ھیں جن میں سے کسی ایک شرط کو نماز کی امامت کے لئے ضروری نھیں سمجھا جاتا ھے ،جیسے : اصول اور فروع دین پر مکمل دسترس اور کامل آگاھی رکھنا۔

احکام اور حدود الٰھی کے تحت مسلمانوں کے امور کو چلانے کی پوری صلاحیت رکھنا۔

گناہ اور خطا سے مبرا ھونا

اس استدلال سے پتا چلتا ھے کہ استدلال کرنے والے نے امامت کے منصب کو ایک معمولی منصب تصور کرلیا ھے اور اس سے پیغمبر کی جانشینی کو ایک عام حکمرانی کے سوا کچھ اور نھیں سمجھا ھے اسی لئے وہ کھتا ھے کہ : جب پیغمبر نے ابو بکر کو دینی امر کے لئے منتخب کرلیا تو لازم اور ضروری ھے کہ ھم ان کی خلافت پر اور بھی زیادہ راضی ھوں ، جو ایک دنیوی امر ھے۔

اس جملہ سے معلوم ھوتا ھے کہ کھنے والے نے اسلامی حکمرانی سے وھی معنی مراد لیا ھے جو دنیا کے عام حکمرانوں کے بارے میں تصور کیا جاتا ھے۔جبکہ پیغمبر کا خلیفہ ظاھری حکومت اور مملکت کے امور کو چلانے کے علاوہ کچھ ایسے معنوی منصبوں اور اختیارات کا بھی مالک ھوتا ھے جو عام حکمراں میں نھیں پائے جاتے اور ھم اس سلسلے میں اس سے پھلے مختصر طور پر بحث کر چکے ھیں۔

3۔اگر نماز کیلئے حضرت ابوبکر کی امامت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے انجام پائی تھی ،تو پیغمبر اکرم بخار اور ضعف کی حالت میں ایک ھاتہ کو حضرت علی (ع) کے شانے پر اور دوسرے ھاتہ کو "فضل بن عباس" کے شانے پر رکہ کر مسجد میں کیوں داخل ھوئے اور حضرت ابوبکر کے آگے کھڑے ھوکر نماز کیوں پڑھائی ؟ پیغمبر کا یہ عمل امامت کے لئے حضرت

ابو بکر کے تعین سے میل نھیں کھاتا۔ اگر چہ اھل سنت علماء نماز میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرکت کی اس طرح توجیہ کرتے ھیں کہ حضرت ابو بکر نے پیغمبر اکرم کی اقتداء کی اور لوگوں نے ابو بکر کی اقتداء کی۔ اسی صورت میں نماز پڑھی گئی (61)

واضح ھے کہ یہ توجیہ بھت بعید اور نا قابل قبول ھے، کیونکہ اگر یھی مقصود تھا تو کیا ضرورت تھی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ضعف و بخار کی حالت میں اپنے چچیرے بھائیوں کا سھارا لیکر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز کے لئے کھڑے ھوتے؟ بلکہ اس واقعہ کا صحیح تجزیہ یہ ھے کہ پیغمبر اکرم اپنی اس کاروائی سے حضرت ابو بکر کی امامت کو توڑ کر خود امامت کرنا چاھتے تھے۔

4۔ بعض روایتوں سے پتا چلتا کہ کہ نماز کے لئے حضرت ابو بکر کی امامت ایک سے زیادہ بار واقع ھوئی ھے اور ان سب کا پیغمبر کی اجازت سے ثابت کرنا بھت مشکل اور دشوار ھے کیونکہ پیغمبر اکرم نے اپنے بیماری کے آغاز میں ھی اسامہ بن زید کے ھاتہ میں پرچم دیکر سب کو رومیوں سے جنگ پر جانے اور مدینہ ترک کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اور لوگوں کے جانے پر اس قدر مصر تھے کہ مکرر فرماتے تھے:

"جھزّ وجیش اسامۃ" اسامہ کے لشکر کو تیار کرو۔

اور جو افراد اسامہ کے لشکر میں شامل ھونے سے انکار کر رھے تھے، آپ ان پر لعنت بھیج کر خدا کی رحمت سے محروم ھونے کی دعا فرماتے تھے(62)

ان حالات میں پیغمبر ابو بکر کو امامت کے فرائض انجام دینے کی اجازت کیسے دیتے؟!

5۔ مؤرخین اور محدثین نے اقرار کیا ھے کہ جس وقت حضرت ابو بکر نماز کی امامت کرنا چاھتے

تھے،پیغمبر اکرم نے حضرت عائشہ، ابوبکر کی بیٹی سے فرمایا: "فانکنّ صواحب یوسف" "تم مصر کی عورتوں کے مانند ہو جنھوں نے یوسف (ع) کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا" اب دیکھنا چاہئے کہ اس جملہ کا مفہوم کیا ہے، اور اس سے پیغمبر کا مقصد کیا تھا؟

یہ جملہ اس امر کی حکایت کرتا ہے کہ حضرت عائشہ پیغمبر اکرم کی تنبیہ کے باوجود اسی طرح خیانت کی مرتکب ہوئی تھیں، جس طرح مصر کی عورتیں خیانت کی مرتکب ہوئیں تھی اور زلیخا کو عزیز مصر سے خیانت کرنے پر آمادہ کرتی تھیں۔

جس خیانت کے بارے میں یہاں پر تصور کیا جاسکتا ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حضرت عائشہ نے پیغمبر اکرم کی اجازت کے بغیر اپنے باپ کو پیغام بھیجا تھا کہ پیغمبر کی جگہ پر نماز پڑھائیں۔

اہل سنت کے علماء، پیغمبر اسلام کے اس جملہ کی دوسرے انداز میں تفسیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

پیغمبر اصرار فرماتے تھے کہ حضرت ابوبکر آپ کی جگہ پر نماز پڑھائیں، لیکن حضرت عائشہ راضی نہیں تھیں، کیونکہ وہ کہتی تھیں کہ لوگ اس عمل کو فال بد تصور کریں گے اور حضرت ابوبکر کی نماز میں امامت کو پیغمبر کی موت سے تعبیر کریں گے اور حضرت ابوبکر کو پیغمبر کی موت کا پیغام لانے والا تصور کریں گے"

کیا یہ توجیہ پیغمبر اسلام کے عمل (مسجد میں حاضر ہو کر امامت کو سنبھالنے) سے میل کھاتی ہے؟!!

یھاں پر میں اپنی بات تمام کرتے ھوئے اس قضیہ کی صحیح نتیجہ گیری کا فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتا ھوں۔

چودھویں فصل

حکومت، روحانی قیادت سے جدا نھیں

اس میں کوئی شک نھیں ھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے حاکم وفرماں روا

ھونے کے ساتھ معنوی اور روحانی پیشوا بھی تھے۔قرآنی آیات،اسلامی متون اور معتبر تاریخ اس امر کے شاھد ھیں کہ پیغمبر اسلام نے مدینہ منورہ میں اپنے قیام کے ابتدائی لمحات سے اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور حقیقی حکمرانی کی تمام ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھائیں اور اسلامی معاشرے کے بعض سیاسی ، سماجی اور اقتصادی امور کو اپنی سرپرستی میں بعض شائستہ اور لائق افراد کو سونپا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدا کی طرف سے فرماں روا اور حاکم ھونے کی بھت سی مثالیں ھیں یھاں ھم قارئین کرام کی توجہ کے لئے ذیل میں صرف چند مثالیں پیش کرتے ھیں:

1۔قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسلمانوں کی جانوں سے اولیٰ قرار دیتے ھوئے فرماتا ھے:

(النَّبِیُّ اَوْلیٰ بِالْمُؤْمِنِینَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ)(63)

بیشک نبی تمام مؤمنین پران کی جانوں سے زیادہ اولیٰ ھے۔

2۔قرآن مجید پیغمبر اکرم کو حاکم وقاضی قرار دیتا ھے کہ مسلمانوں کے درمیان الٰھی قوانین کے تحت فیصلے کرے، چنانچہ اس سلسلے میں فرماتا ھے:

(فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ)(64)

”آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق فیصلہ کریں اور خدا کی طرف سے آئے ھوئے حق سے الگ ھوکر ان کے خواھشات کا اتباع نہ کریں“

3۔پیغمبر اکرم لوگوں میں نہ صرف خود فرماں روائی اور حکمیت کے فرائض انجام دیتے تھے بلکہ

ھر علاقے کو فتح کرنے کے بعد، وھاں پر خود ایک شائستہ شخص کو بعنوان حاکم، دوسرے کو قاضی کی حیثیت سے اور تیسرے کو قرآن و احکام الٰھی کی تعلیم دینے کے لئے دینی معلم کی حیثیت سے مقرر فرماتے تھے اور بعض اوقات یہ تینوں عھدے ایک ھی فرد کو سونپتے تھے۔
پیغمبر اکرم کے زمانے میں ھی امیر المؤمنین علی علیہ السلام عبداللہ ابن مسعود، ابی ابن کعب اور زید بن ثابت وغیرہ قضاوت اور حکمیت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔(65)
جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ اور یمن کو فتح کیا تو "عتاب بن اسید" کو مکہ کا گورنر اور "بازان" کو یمن کا حاکم منتخب فرمایا:
کتاب "التراتیب الاداریہ" کے مؤلف "عبدالحی کتانی" نے اپنی کتاب میں ان مسلمان گورنروں کی فھرست ذکر کی ھے، جنھیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانے میں مختلف علاقوں کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی امور کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے منتخب فرمایا تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پیغمبر اسلام کے ذریعہ تشکیل دی گئی اسلامی حکومت کے طریقہ کار کا اشارہ ملتا ھے(66)
اسلام نے جھاد کی دعوت دے کر اور دینِ الٰھی کو پھیلانے کیلئے جھاد کے خصوصی قوانین بیان کئے اور مسلمانوں میں جنگی اور دفاعی تربیت کو وسیع پیمانے پر رائج کیا۔ ساتھ ھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 27 جنگوں میں بذات خود حصہ لیا اور 55 "سریہ" (67) میں لشکر کے سردار معین کئے۔ اس طرح سے اسلامی حکومت کا چھرہ لوگوں کے سامنے نمایاں فرمایا اور یہ ثابت کردیا کہ آپ (ع) کی دعوت حضرت عیسی علیہ السلام کی دعوت کے مانند فقط روحانی،

معنوی دعوت نھیں ھے آپ کی رھبری احکام بیان کرنے اور تبلیغ دین کے لئے صرف وعظ و نصیحت تک محدود نھیں ھے بلکہ آپ کی دعوت ومعنوی رھنمائی ایک طاقتور حکومت کی تشکیل کے ھمراہ تھی تا کہ اپنے پیروؤں کو دشمنوں کے گزند سے محفوظ رکہ سکیں، کتاب خدا اور دین اسلام کو ان سے بچاسکیں اور یہ حکومت انسانی سماج میں الٰھی قوانین کے نفاذ کی ضامن بن سکے۔

اسلام کا اقتصادی نظام،حکومتی آمدنی، جیسے انفال وغیرہ اورعوامی آمدنی جیسے زکات وخمس وغیرہ اس امرکی واضح دلیل ھے کہ اسلام ایک جامع وکامل نظام ھے جس نے انسانوں کی سماجی زندگی کے تمام پھلوؤں میں ایک مکمل اورھمہ گیرنظریہ پیش کیا ھےاورصرف محدود پیمانے پر خشک مذھبی مراسم، وہ بھی ھفتہ میں ایک روز کی عبادت پر اکتفاء نھیں کیا ھے۔

لیکن اس جملے کا ھرگز یہ مطلب نھیں ھے کہ حقیقی عیسائی دین کی بنیادیھی تھی، بلکہ میسیحیت کے خودغرض مدعیوں نے قیصر و پاپ کے روپ میں دین مسحیت کورفتہ رفتہ اس صورت میں تبدیل کیا ھےاورحضرت عیسی (ع) کے دین کوسماجی میدان سے خارج کرکے رکہ دیا ھے جب کہ بھت سے پیغمبراس مقام ومنصب کے مالک تھے۔

قرآن مجید بالکل واضح طور پرحضرت لوط اورحضرت یوسف علیھما السلام کے بارے میں کھتا ھے:

”کہ ھم نے انھیں حکومت اورفرمان روائی دی“(68)

خودحضرت یوسف بارگاہ الٰھی میں حمد وثنا کرتے ھوئے فرماتے ھیں:

(رَبِّ ءَاتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ)

پروردگارا! تو نے مجھے ملک عطا کیا (69)

قرآن مجید نے حضرت داؤد کی قضاوت اوران کی حکومت، اور حضرت سلیمان وطالوت کی فرمان روائی اورحکومت کے لئے ان کی امتیازی حیثیتوں کا ذکر کیا هے۔اس طرح پیغمبروں کو الٰهی حکومت کے بانی اور حکم الٰهی نافذ کرنے والوں کی حیثیت سے پهچنوایا هے۔

امر بالمعروف ونهی عن المنکر کے وسیع ابواب جوحکومت اسلامی کے نفاذ کی عملی بنیادوں میں سے ایک هیں اوراسی طرح معاملات، حدود، دیات اورفقه کے دیگر ابواب کے تمام قوانین کے مطالعه سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قائم کی گئی حکومت کا طریقه کار هر شخص کے لئے واضح وروشن هوتا هے۔

یه مسئله اس قدر واضح هے اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور خلفاء کی حکومت خصوصاً امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی الٰهی حکومت کے دوراس امر کے اتنے نمایاں گواه هیں که هم اس سلسلے میں مزید وضاحت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے هیں۔

بیان احکام اور لوگوں کی رهنمائی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکومت اور سیاسی فرمان روائی کے علاوه احکام الٰهی کو بیان کرنے والے الٰهی قوانین کے مفسر اور قرآن مجید کی آیات کے اغراض ومقاصد بیان کرنے کے عهده دار بھی تھے۔

قرآن مجید آپ کومندرجہ ذیل آیہ شریفہ میں کتابِ خدا کے عالی مفاھیم بیان کرنے والے کی حیثیت سے پہچنوایا ھے:

(وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ)

اورآپ کی طرف ذکر (قرآن) کونازل کیا ھے تاکہ لوگوں کے لئے ان احکام کوواضح کردیں جوان کی طرف نازل کئے گئے ھیں۔(70)

آیہ شریفہ میں کلمہ "لِتُبَيِّنَ" تاکہ آپ بیان کریں) سے واضح ھوتا ھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کے علاوہ اس امر پر بھی مأمور تھے کہ ان آیات کے مفاھیم اور مضامین کی وضاحت فرمائیں۔اگرآپ کا فریضہ صرف آیات الٰھی کو پڑھنا ھوتا تو کلمہ "لِتُبَيِّنَ" کے بجائے "لِتَقْرَأَ" یا "لِتَتْلُوَ" ھوتا۔

بیشک قرآن مجید کے حکم کے مطابق آنحضرت کتابِ خدا اوراس کے حکیمانہ احکام کے معلّم ھیں، جیسا کہ فرماتا ھے:

(هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّيِّينَ رَسُولاً مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ)

"اس خدانے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جوانھیں میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے، ان کےنفوس کو پاکیزہ بنائے اورانھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے"(71)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے دوران ان دوعھدوں (حاکمیت اور الٰھی احکام کے نفاذ) نیز احکام کی رھنمائی وتبلیغ پر فائز تھے اور یقینا آپ کی رحلت کے بعد بھی، اسلامی معاشرے کوایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جوان دومنصبوں کا حامل ھو۔

اب ھمیں دیکھنا چاھئے کہ ان خصوصی شرائط کا حامل کون شخص ھے جو ان دو امور میں معاشرے کی باگ ڈور سنبھال سکے؟

واضح ھے کہ احکام بیان کرنا اور لوگوں کو حلال وحرام بتانا، اخلاقی فضائل اور ان کی فطری خوبیوں کی راھنمائی کرنا یعنی ایک جملہ میں یوں کھا جائے کہ: دینی رھبری اور معنوی امور کی قیادت کے لئے عصمت اور خطا و گناہ سے پاک ھونے اور وسیع علم کا مالک ھونے کی ضرورت ھے کیونکہ لوگوں پر مکمل قیادت، جس میں پیشوا کا قول وفعل لوگوں کے لئے ھادی و رھنما ھو، اس کی مکمل پرھیز گاری (جسے عصمت کھتے ھیں) اور وسیع علم پر منحصر ھے۔

دوسرے الفاظ میں: اسلامی معاشرے کے قائد کو احکام اور اصول وفروع دین پر مکمل دسترس ھونی چاھئے، اس کے بغیر وہ لوگوں کے لئے مکمل راھنما اور الٰھی رھبر نھیں بن سکتا، اگلے صفحات میں ھم ثابت کریں گے کہ ھمہ گیر رھبری و رھنمائی عصمت کے بغیر ممکن نھیں ھے۔

قرآن مجید خدائے تعالیٰ کی طرف سے طالوت کو فرمان روائی کے عھدے کیلئے منتخب کرنے کا سبب دو چیزیں بیان فرماتا ھے:

1۔علم و دانش میں برتری

2۔جسمانی لحاظ سے طاقتور ھونا، جس کی وجہ سے دن رات، وقت بے وقت قوم کے لئے کام کر سکے اور قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکے (حکام کے لئے دوسری شرط زمانہ قدیم سے تجربہ کے ذریعہ ثابت ھو چکی ھے، حتی یہ بات ضرب المثل بن گئی ھے کہ: صحیح عقل وفکر صحت مند بدن میں ھوتی ھے) اب یہ آیہ شریفہ ملاحظہ ھو:

(اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰہُ عَلَیۡکُمۡ وَزَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ)

"انھیں (طالوت کو) اللہ نے تمھارے لئے منتخب کیا ھے اور ان کے علم وجسم میں وسعت فرمائی ھے" (72)

امیر المؤمنین علیہ السلام جب اپنے سپاھیوں اور افسروں کو خطاب فرماتے تھے اور انھیں خدا کی راہ میں جھاد کرنے کی ترغیب ودعوت دیتے تھے تو اسلامی معاشرے کو ھر جھت سے ادارہ کرنے کی اپنی صلاحیت اور شائستگی بیان کرنے کے لئے اسی آیہ شریفہ سے استدلال کرتے تھے اور فرماتے تھے:

لوگو! اس قرآن مجید کی پیروی کرو اور اس سے نصیحت حاصل کرو جسے خدائے تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر نازل کیا ھے ھم قرآن مجید میں پڑھتے ھیں کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰ (ع) کی وفات کے بعد اپنے پیغمبر سے درخواست کی کہ خداوند عالم ان کے لئے ایک حاکم وفرماں روا منتخب کرے جس کی رھبری میں وہ خدا کی راہ میں جھاد کریں۔ خدائے تعالیٰ نے حضرت طالوت کو ان کی فرماں روائی کیلئے منتخب فرمایا، لیکن بنی اسرائیل نے ان کی اطاعت نھیں کی ، اور اس کام کے لئے ان کی صلاحیت اور شائستگی میں شک کرنے لگے۔ خدائے تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے کھدو کہ اس منصب کے لئے طالوت کے انتخاب کا سبب علمی لحاظ سے ان کی برتری اور جسمی توانائی ھے۔

لوگو! ان قرآنی آیات میں تم لوگوں کے لئے پند وعبرت پوشیدہ ھے۔ خدائے تعالی نے اس لئے طالوت کو ان کے لئے حاکم اور فرمانروا قرار دیا تھا کہ وہ علم وجسمی توانائی میں ان سے برتر

تھےاور وہ ان خصوصیات کی بنا پر جھاد و جد وجھد کر سکتے تھے(73)

حضرت امام حسن مجتبیٰ (ع) بھی اھل بیت رسول کی خلافت و امامت کے لئے شائستگی ثابت کرنے

کے لئے تمام الٰھی احکام اور امت کی تمام ضرورتوں کے بارے میں ان کے علم پر تکیہ کرتے ھوئے فرماتے ھیں:

لوگو! امت کے پیشوا ھمارے خاندان سے ھیں اور پیغمبر کی جانشینی کی صلاحیت ھمارے علاوہ کوئی نھیں رکھتا، خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے پیغمبر کے ذریعہ ھمیں اس منصب کے لئے شائستہ قرار دیا ھے، کیونکہ علم و دانش ھمارے پاس ھے، اور ھم قیامت تک رونما ھونے والے ھر حکم، حتی بدن پر لگی ایک معمولی خراش کے حکم سے بھی آگاہ ھیں(74)

دو منصبوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا صحیح نھیں

حاکمیت کو معنوی قیادت کے منصب سے جدا کرنا ایسی چیز نھیں ھے جو اھل سنت علماء کی تازہ فکری پیداوار ھو بلکہ یہ بھت پرانی تاریخ ھے۔

اس کی وضاحت یہ ھے کہ سقیفہ کا ماجرا ختم ھوا اور حضرت ابو بکر نے امور اپنے ھاتہ میں لئے اور ظاھراً حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں میں ایک گروہ ایسا تھا، جو امیر المؤمنین کو خلافت کے عھدے سے محروم کرنے پر سخت ناراض تھا، کیونکہ جنگ تبوک(75)

کے لئے مدینہ سے باھر نکلتے وقت، غدیر (76) کے دن اور اپنی بیماری (77) کے ایام میں پیغمبر اسلام کے ارشادات بھی ان کے کانوں میں گونج رھے تھے۔

اس لئے کچھ حق پسند افراد اس ڈرامائی انداز میں خلافت کے غصب کرنے پر سخت غصے میں آئے، یہ لوگ کسی فریق کی طرفداری کئے بغیر خلیفہ کے پاس جا کر علی (ع) کے بارے میں سوال کرتے تھے، خلیفہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نھیں تھا کہ دو منصبوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ضروری ھے وہ کھتے تھے کہ" منصب حکومت اور معنوی قیادت ھرگز ایک ساتھ ایک خاندان میں جمع نھیں ھوسکتے"

رسول خدا کا ایک صحابی بریدہ بن خصیب، پیغمبر کی رحلت کے وقت مدینہ سے باھر ماموریت پر گیا تھا۔ وہ پیغمبر کی رحلت کے بعد واپس مدینہ آیا اور اس نے حالات کو دگرگوں پایا، تو ایک پرچم حضرت علی (ع) کے دروازے پر نصب کر کے غصہ کی حالت میں مسجد میں داخل ھوا اور خلیفہ اور ان کے ھمفکروں کے ساتھ بحث کرتے ھوئے کھنے لگا:

''کیا تم لوگوں کو یاد نھیں ھے کہ ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ھم سب کو حکم دیا تھا کہ حاکم اور امیر المؤمنین کی حیثیت سے حضرت علی علیہ السلام کو سلام کرو اور کھو:" السلام علیک یا امیر المؤمنین (78) اب کیا ھوا ھے کہ تم لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت اور سفارش کو فراموش کر بیٹھے؟

خلیفہ نے" بریدہ" کے سوال کے جواب میں دونوں منصبوں کو جدا کرنے کا اپنا نظریہ بیان کرتے ھوئے کھا: خدائے تعالیٰ ھر دن ایک کام کے بعد دوسرا کام انجام دیتا ھے اور ایک

خاندان میں نبوت (معنوی قیادت) اور حکمرانی کو جمع نھیں کرتا۔
یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اھل بیت (ع) یا امت کے معنوی پیشوا ھوں گے تا کہ احکام وشریعت الٰھی کو بیان کریں یا حکمراں، یہ دونوں منصب ایک ساتھ جمع نھیں ھو سکتے، خلیفہ کی بات پر ذرا دقت سے غور کریں ان کا مقصد یہ نظر نھیں آتا کہ یہ دو منصب ھر گز کبھی ایک ساتھ جمع نھیں ھو سکتے، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں منصبوں کے مالک تھے۔ آپ مسلمانوں کے حاکم بھی تھے اور معنوی قائد بھی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ حضرت سلیمان (ع) جیسے دوسرے پیغمبر بھی ان دونوں عھدوں پر فائز تھے۔
یقینا ان کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبر کی رحلت کے بعد یہ دو مقام اور منصب آنحضرت کے خاندان میں جمع نھیں ھوں گے، لیکن یہ نظریہ بھی گزشتہ نظریہ کی طرح باطل اور بے بنیاد ھے۔ لھذا جب حضرت امام باقر علیہ السلام اصحاب سقیفہ کے اس نظریہ "جدائی" کو نقل کرتے تھے تو فوراً مندرجہ ذیل آیہ شریفہ، جو فرزندان ابراھیم میں ان دونوں منصبوں کے جمع ھونے کی حکایت کرتی ھے سے اس نظریہ کو باطل قرار دیتے تھے۔
(اَمۡ یَحۡسُدُونَ النَّاسَ عَلٰی مَا ءَ اتَ--ھُمُ اللہُ مِنۡ فَضۡلِہ فَقَدۡ آتَیۡنَا ءَ الَ إِبۡرَاھِیمَ الۡکِتَابَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَآتَیۡنَاھُمۡ مُلۡکاً عَظِیماً) (79)
یا وہ ان لوگوں سے حسد کرتے ھیں جنھیں خدا نے اپنے فضل وکرم سے بھت کچھ عطا کیا ھے تو پھر ھم نے آل ابراھیم کو کتاب وحکمت اور ملک عظیم (بڑی فرمانروائی) سب کچھ عطا کیا ھے"
امام باقر علیہ السلام نے مذکورآیہ شریفہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:
"فکیف یقرّون فی آل ابراھیم و ینکرونہ من آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم"

پس یہ لوگ کس طرح ان دونوں منصبوں کے خاندان ابراھیم (ع) میں جمع ھونے کا اعتراف کرتے ھیں، لیکن اسی چیز کے خاندان محمد میں جمع ھونے کا انکار کرتے ھیں"

عیسائی تفکر

حقیقت میں ان دونوں منصبوں کا ایک دوسرے سے جدا ھونا، ایک قسم کا عیسائی تفکر ھے جو اس نظریہ کے ھمفکروں کی زبان پر جاری ھوا ھے۔ کیونکہ یہ موجودہ تحریف شدہ عیسائی دین ھے جو یہ کھتا ھے کہ میں اس امر پر مامور ھوں کہ امور قیصر کو خود قیصر کو سونپ دوں، لیکن دین اسلام کے تمام قوانین ایک مکمل مادی ومعنوی ضابطہ حیات کی حکایت کرتے ھیں کہ جو بشر کی تمام سماجی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ھے۔

دین اسلام، جس کی بنیاد اور احکام وقوانین کے تانے بانے انسانی سیاست یعنی اسلامی سماج کے امور کی تدبیر کو تشکیل دیتے ھیں اس میں معنوی رھبری کو حکومت اور فرماں روائی سے جدا نھیں کیا جاسکتا ھے۔

بیشک اسلام میں لوگوں پر حکومت وفرماں روائی بذات خود مقصد نھیں ھے بلکہ اسلامی حاکم اس لحاظ سے اس منصب کو قبول کرتا ھے کہ اس کے سائے میں حق کو زندہ کرسکے اور باطل کو نابود کرے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو احیائے حق کا وسیلہ جاننے کے بجائے خود حکومت کو مقصد

قرار دئے جانے پر اعتراض کرتے ھوئے فرماتے ھیں:

"و انّ دنیا کم هذه ازهد عندی من عفطة عنز" (80)

یعنی تم لوگوں کی دنیا اور یہ حکومت جس کے لئے ھاتہ پاؤں مار رھے ھو، میری نظر میں بکری کی ناک سے بھنے والے پانی کے برابر بھی قدر و قیمت نھیں رکھتے۔

ماضی اور حال کے کچھ روشن خیال افراد یہ سوچتے ھیں کہ شیعہ وسنی کے درمیان اتحاد کا طریقہ یہ ھے کہ ان دو منصبوں کو خلفاء اور اھل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تقسیم کر دیا جائے، حکومت اور فرماں روائی کو خلفاء کا حق اور معنوی قیادت کو اھل بیت علیھم السلام کا حق جان لیں۔ اس طرح اس چودہ سو سالہ جھگڑے کو ختم کر دیں اور مسلمانوں کو مشرق و مغرب کی دو سامراجی طاقتوں کے خلاف متحد و طاقتور بنائیں۔

لیکن یہ نظریہ بھی غلط ھے کیونکہ اس طرح اس اتحاد کی بنیاد ایک غلط نظریہ پر قائم ھوگی جس سے ایک قسم کی عیسائیت اور سیکولرزم کی بو آتی ھے۔ ھم قرآن مجید کے واضح حکم کے خلاف ان دو منسبوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے اسے قربانی کے گوشت کی طرح کیوں تقسیم کریں؟!

مسلمانوں کے درمیاں اتحاد و یکجھتی کے لئے دوسرا راستہ موجود ھے اور وہ ایسے مشترکات ھیں جو دونوں فرقوں میں پائے جاتے ھیں۔ کیونکہ سب ایک کتاب، ایک پیغمبر اور ایک قبلہ کی پیروی کرتے ھیں اور بھت سے اصول و فروع میں اتفاق نظر رکھتے ھیں، لھذا دوسرے مسائل میں اختلاف آپس میں ٹکراؤ اور خوں ریزی کا سبب نھیں ھونا چاھیے۔ لیکن سیاسی اتحاد و یکجھتی کے تحفظ کے ساتھ ھر فرقہ کو اپنے عقائد کے صحیح اور منطقی دفاع کا پورا پورا حق ھونا چاھئے

اور اپنے عقائد کے دفاع کے ساتھ ساتھ اپنے مشترک دشمن (سامراج اور صیھونزم) کے خلاف دیگر مسلمانوں کے ساتھ اتحاد و یکجھتی کی ضرورت کوفراموش نہ کرنا چاھئے۔

پندرھویں فصل

اسلامی احکام سے خلفاء کا ناآشنا ھونا

گزشتہ گفتگو سے یہ پوری طرح ثابت ھوا کہ ایک مکمل مذھبی قیادت کے لئے دین کے اصول وفروع سے متعلق وسیع علم اور اسلامی معاشرہ کی ضرورتوں سے مکمل آگاھی ضروری ھے اور

اس طرح کی مکمل آ گاھی کے بغیر مذھبی قیادت ممکن نھیں ھے۔

کیونکہ بشر کی تخلیق کا مقصد یھی ھے کہ وہ شریعت الٰھی پر عمل کرتے ھوئے اورارتقاء وکمال تک پھنچنے اور پیغمبروں کے بھیجے جانے اورشرعی وقوانین کےنفاذ کا مقصد بھی اس کے سوا کچھ نھیں کہ انسان کوگمراھیوں سے بچا لیا جائے اوراسے کمالات وفضائل کی طرف رھنمائی کی جائے۔الٰھی قوانین پرعمل کرتے ھوئے ترقی کی منزلیں طے کرنا اس صورت میں ممکن ھے جب الٰھی فرائض واحکام بندوں کی دسترس میں ھوں تا کہ کمال کی راہ طے کرنے والوں کے لئےکوئی عذرو بھانہ باقی نہ رھے یاان کی راہ سے رکاوٹیں دور کی جائیں۔

تمام احکام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے شرط ھے کہ پیغمبر کے بعد لوگوں میں کوئی ایسا شخص موجود ھوجو سماج کی دینی ضرورتوں سے پوری طرح آ گاہ ھو۔تا کہ لوگوں کوارتقاء وکمال کا راستہ اورصراط مستقیم دکھائے اورتخلیق کے مقاصد کوصحیح ثابت کرنے میں ذرا بھی غفلت سے کام نہ لے۔

خلفائے ثلاثہ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے واضح ھوتا ھے کہ ان میں سےکوئی ایک بھی ان خصوصیات کا حامل نہ تھا اوراحکام ولوگوں کی دینی ضروریات کے بارے میں ان کے معلومات بھت ضعیف تھے۔

قرآن مجید کے بعد اسلامی معاشرہ کوارتقاء بخشنے کا واحد راستہ سنن واحادیث پیغمبر سے آ گاھی ھے کہ ان کا اعتبار اورحجیت تمام مسلمانوں کی نظر میں مسلّم ھے۔قرآن مجید نے بھی بھت سی آیات میں سنّت اوراحادیث پیغمبر پرعمل کوضروری قرار دیا ھے مثال کے طور پر درج ذیل

آیہ شریفہ ملاحظہ ہو:

(مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا) (81)

"جو رسول تمھیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کر دے اس سے رک جاؤ"

لیکن مذکورہ خلفاء اسلامی احکام کے بارے میں کوئی نمایاں آگاھی نھیں رکھتے تھے اور ان ناقص اور معمولی معلومات کے ذریعہ انسانی قافلہ کو ھرگز کمال کی منزل تک نھیں پھنچایا جا سکتا ھے، جس کے لئے خود اسلامی احکام پر عمل پیرا ھونا لازم ھے۔

احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں جو روایتیں حضرت ابوبکر سے نقل کی ھیں ان کی کل تعداد 80 احادیث سے زیادہ نھیں ھے (82) جلال الدین سیوطی نے انتھائی کوشش کر کے ان کی تعداد 104 تک پھنچائی ھے (83)

سرانجام حضرت ابوبکر سے نقل کی گئی روایتوں کی آخری تعداد 142 بتائی گئی ھے (84) ان میں سے بھی بعض روایتیں نھیں ھیں بلکہ یہ باتیں ھیں جو ان سے نقل کی گئی ھیں مثلا ایک حدیث جو ان سے نقل کی گئی ھے اور انھی 142 احادیث میں شمار ھوتی ھے یہ جملہ ھے:

"ان رسول اللہ اھدیٰ جملاً لأبی جھل"

یعنی پیغمبر نے ابوجھل کو ایک اونٹ ھدیہ کے طور پر دیا"

اس کے علاوہ ان سے نقل کی گئی کئی احادیث قرآن مجید اور عقل کے منافی ھیں مثلاً درج ذیل دو حدیثیں ملاحظہ ھوں:

1۔ "ان المیت ینضح علیہ حمیم ببکاء الحی"

یعنی، زندہ لوگوں کے رونے سے مردے پر گرم پانی ڈالا جاتا ھے۔

واضح ھے کہ اس حدیث کا مضمون چند لحاظ سے مردود ھے:

اولاً: میت پر معقول رونا، انسانی جذبات کی علامت ھے اور پیغمبر اکرم نے اپنے بیٹے حضرت ابراھیم (ع) کے سوگ میں شدت سے آنسو بھائے تھے اور فرماتے تھے:

" پیارے ابراھیم! ھم تیرے لئے کچھ نھیں کر سکتے، تقدیر الٰھی ٹالی نھیں جاسکتی، تیری موت پر تیرے باپ کی آنکھیں اشک بار ھیں اور اس کا دل محزون ھے، لیکن میں ھرگز ایسی بات زبان پر جاری نھیں کروں گا قھر خدا کا سبب بنے۔(85)

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم " جنگ مؤتہ" میں " جعفر ابن ابو طالب" کی شھادت کی خبر سے آگاہ ھوئے، تو آپ اس قدر روئے کہ آپ کی ریش مبارک پر آنسو جاری ھو گئے تھے (86)

دوسرے یہ کہ ھم فرض بھی کرلیں کہ اس قسم کا رونا صحیح نہ ھوگا، تو آخر کسی ایک کے عمل سے دوسرا کیوں عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ قرآن مجید فرماتا ھے:

(وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرَیٰ)(87)

اور کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجہ نہ اٹھائے گا۔

پھر ابوبکر کے نقل کے مطابق پیغمبر اکرم نے یہ کیسے فرمادیا کہ کسی کے رونے سے، ایک بے بس مردہ عذاب میں مبتلا ھوگا؟!

2۔ "انما حرّ جهنّم علی امتی مثل الحمّام"

یعنی، میری امت کے لئے جھنم کی گرمی حمام کی گرمی کے مانند ھے۔

یہ بیان گناھگاروں کے گستاخ ھونے کا سبب بننے کے علاوہ، جھنم کے بارے میں قرآن مجید

میں بیان شدہ نصوص کے بالکل خلاف ھے۔ جیسے" وقودھا الناس والحجارۃ "اس کا ایندھن پتھر اور انسان ھیں اور اس آگ کے کوہ پیکر شعلے بیدار دلوں کو پگھلا دیتے ھیں

بھر حال جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، جو احادیث حضرت ابوبکر سے نقل ھوئی ھیں وہ یا ان کے معمولی بیانات ھیں یا وہ چیزیں ھیں جو عقل وقرآن مجید سے ٹکراؤ رکھتی ھیں۔ اور جسے حدیث کا نام دیا جائے ان میں بھت کم ملتی ھے۔

ظاھر ھے کہ ایسا شخص، ان ضعیف اور ناچیز معلومات کے ساتھ اسلامی معاشرے کو ارتقا اور کمال کی طرف رھنمائی نھیں کرسکتا اور امت کی ضروریات کو پورا نھیں کرسکتا۔

خلیفہ، خود اپنے ایک بیان میں اپنی معلومات سے پردہ اٹھاتے ھوئے کھتے ھیں:

"انّی ولیت و لست بخیر کم و ان رأیتمونی علی الحق فأعینونی و ان رأیتمونی علی الباطل فسددونی (88)

اے لوگو! تمھارے امور کی باگ ڈور میرے ھاتہ میں دیدی گئی ھے، جبکہ میں تم میں سے بھترین فرد نھیں ھوں، اگر تم لوگ مجھے حق پر دیکھو تو میری مدد کرو اور اگر مجھے باطل پر دیکھو تو میری مخالفت کرو اور مجھے اس کام سے روکو"

دین و مذھب کے قائد کو جس کے نقش قدم پر اسلامی معاشرے کو چلنا ھے دینی مسائل میں امت سے مدد کا محتاج نھیں ھونا چاھیئے۔ یہ ھرگز مناسب نھیں ھے کہ دینی قائد بجائے اس کے کہ امت کو تخلیق کے مقصد کی طرف راھنمائی کرے اپنی غلطیاں اور گمراھیاں سدھارنے کے لئے امت سے مدد مانگے۔

خلیفہ اول کی لاعلمی کے چند نمونے

یهاں پرهم خلیفہ کے معلومات سے متعلق چند نمونے پیش کرتے هیں جو بذات خود دینی مسائل کے بارے میں ان کے معلومات کی سطح کے گواہ هیں ۔ یہ نمونے اس امر کی حکایت کرتے هیں کہ وہ بهت سے روزمرہ کے مسائل کے جواب سے بھی ناواقف تھے:

1۔"دادی" کی وراثت کا مسئلہ عام مسائل میں سے هے خلیفہ اس کے بارے میں آگاهی نهیں رکھتے تھے۔ایک عورت کا پوتا فوت هوگیا تھا اور اس نے اس سلسلے میں ان سے حکم خدا پوچھا، انھوں نے جواب دیا کہ: کتاب خدا اور پیغمبر کے ارشادات میں اس بارے میں کچھ بیان نهیں هوا هے۔اس کے بعد اس عورت سے کها: تم جاؤ، میں رسول خدا کے صحابیوں سے پوچھوں گا کہ کیا انھوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلے میں کچھ سنا هے؟! مغیرۃ بن شعبہ جو اسی مجلس میں موجود تھا، اس نے کها: میں پیغمبر خدا کی خدمت میں تھا، آپ نے دادی کے لئے میراث میں سے 3/1 حصہ مقرر فرمایا تھا۔(89)

خلیفہ کی لاعلمی زیادہ تعجب خیز نهیں هے بلکہ تعجب اس بات پر هے کہ اس نے مغیرہ جیسے آلودہ اور بدکردار شخص سے حکم الهی سیکھا۔

2۔ایک ایسا چور خلیفہ کے پاس لایا گیا جس کا ایک هاتھ اور ایک پاؤں کاٹا جاچکا تھا، انھوں نے حکم دیا اس کا پاؤں کاٹ دیا جائے، خلیفہ دوم نے اشارہ کیا کہ ایسے موقع پر سنت پیغمبر یہ هے کہ هاتھ کاٹا جائے، اس پر خلیفہ نے اپنا نظریہ بدل دیا اور خلیفہ دوم کے نظریہ کی پیروی کی (90)

ان دونمونوں سے فقہ اسلامی کے بارے میں خلیفہ کی معلومات کے کمی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ھے اور واضح ھے کہ اس قدر معلومات کے فقدان اور مغیرہ جیسے افراد سے رجوع کرنے والے شخص کے ھاتھوں میں معاشرے کی معنوی قیادت کی باگ ڈور ھرگز نھیں دی جاسکتی ھے جس کی بنیادی شرط اسلامی احکام سے متعلق وسیع معلومات کا حامل ھونا ھے۔

خلیفہ دوم کی معلومات کا معیار

حضرت عمر نے جن احادیث کو پیغمبر سے نقل کیا ھے ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نھیں ھے۔
درج ذیل داستان خلیفہ دوم کے فقھی معلومات کی سطح کی صاف گواہ ھے:
1۔ایک شخص نے حضرت عمر کے پاس آکر ان سے دریافت کیا: مجنب ھوں اور پانی تک رسائی نھیں حاصل کرسکا۔ایسے میں میرا فریضہ کیا ھے؟
حضرت عمر نے جواب دیا: تم سے نماز ساقط ھے، خوشقسمتی سے " عمار" اس جگہ موجود تھے انھوں نے خلیفہ کی طرف رخ کرکے کھا: یاد ھے کہ ایک جنگ میں ھم دونوں مجنب ھوئے تھے اور پانی نہ ھونے کی وجہ سے، میں نے مٹی سے تیمم کرکے نماز پڑھی تھی، لیکن تم نے نماز نھیں پڑھی تھی؟ جب پیغمبر سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: کافی تھا اپنے ھاتھوں کو زمین پر مار کر چھرے پر ملتے یعنی تیمم کرتے۔
خلیفہ نے عمار کی طرف رخ کرکے کھا: خدا سے ڈرو؟ (یعنی اب اس بات کو بیان نہ کرنا)
عمار نے کھا: اگر آپ نھیں چاھتے تو میں اس واقعہ کو کھیں بیان نھیں کروں گا (91)

یہ واقعہ اھل سنت کی کتابوں میں مختلف صورتوں میں نقل ھوا ھے اور یہ تمام صورتیں اس امر کی حکایت کرتی ھیں کہ خلیفہ دوم مجنب کے بارے میں جس کے پاس پانی نہ تھا حکم الٰھی سے بے خبر تھے۔

قرآن مجید نے دوسوروں (92) میں ایسے شخص کا فریضہ بیان کیا ھے۔لیکن ایسا لگتا ھے کہ قرآن مجید کی یہ دوآیتیں خلیفہ کے کانوں تک نھیں پھنچی تھیں!

ایسا شخص جو بارہ سال تک کوشش کے بعد صرف سورہ بقرہ یاد کرسکے اوراس کے شکرانہ کے طور پرقربانی کرے(93)، بھلا وہ کس طرح ان آیات تک آسانی سے رسائی حاصل کرسکتا ھے ؟!

2۔شکیات نماز کے احکام ایسے احکام ھیں جن کی ھر مسلمان کوضرورت ھوتی ھے، بھت کم ایسے متدین افراد پیدا ھوں گے جوان احکام سے آشنائی نہ رکھتے ھوں اب ذرا دیکھئے کہ اس سلسلے میں خلیفہ کی معلومات کس سطح کی تھی؟

ابن عباس کھتے ھیں: ایک دن حضرت عمر نے مجھ سے پوچھا: اگرایک شخص اپنی نماز کی تعداد کے بارے میں شک کرے تو اس کا فریضہ کیا ھے؟ میں نے خلیفہ کو جواب دیا کہ: میں بھی اس مسئلہ کے حکم سے واقف نھیں ھوں، اسی اثنا میں عبدالرحمان بن عوف آئے اورانھوں نے اس سلسلے میں رسول خدا کی ایک حدیث بیان کی (94)

شاید اس سلسلے میں ابن عباس کا جواب سنجیدہ نہ تھا، اور اگر رھا بھی ھو تو بھی خلیفہ کی ایسے موضوع کے سلسلہ میں ناآگاھی واقعاً حیرت انگیز ھے!!

3۔مستحب ھے کہ عورتوں کا مھر چار سو دینار سے زیادہ نہ ھو،حتی حدیث کی اصطلاح میں فقھا اسے "مھر السنة" کھتے ھیں ،لیکن اس کے باوجود ھر فرد اپنی شریک حیات کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ مھر مقرر کرسکتا ھے۔

ایک دن خلیفہ نے منبر سے مَھر زیادہ ھونے کے خلاف تنقید کی اور اس مخالفت کا اس حد تک اظھار کیا کہ اعلان کردیا کہ مھر کی زیادتی منع ھے۔جب خلیفہ منبر سے نیچے اترے تو ایک عورت نے سامنے آکر ان سے سوال کیا: آپ نے عورتوں کے مھر میں اضافہ پر پابندی کیوں لگادی، کیا خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ نھیں فرمایا ھے:

(وَآتَیْتُمْ اِحْدٰیهُنَّ قِنْطَاراً)(95)

اگرعورتوں میں سے ایک کو زیادہ مال دیدیا ھے تو حرج نھیں ھے"

اس وقت خلیفہ نے اپنی غلطی کا احساس کیا اور بارگاہ الٰھی میں رخ کر کے کھا:"خدایا! مجھے بخش دے اور اس کے بعد کھا: تمام لوگ احکام الٰھی کے بارے میں عمر سے زیادہ واقف ھیں (96)اس کے بعد دوبارہ منبر پر جا کر اپنی بات کی تردید کردی(97)

4۔شاید ھی کوئی ایسا شخص ھوگا جو یہ نہ جانتا ھو کہ الٰھی فرائض کی انجام دھی کے لئے عقل، طاقت اور بلوغ شرط ھے۔اس کے باوجود،حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں ایک پاگل عورت کو بدکاری کے جرم میں خلیفہ کے حضور میں لایا گیا اور انھوں نے حکم صادر کردیا کہ اسے سنگسار کیا جائے۔خوشبختی سے جب مامور اسے سنگسار کرنے کے لئے لے جارھے تھے ،حضرت علی(ع) سے ملاقات ھوگئی۔امام جب حقیقت سے آگاہ ھوئے تو انھیں واپس

لوٹنے کا حکم دیا۔ جب خلفیہ کے پاس پھنچے تو ان کی طرف رخ کر کے فرمایا: کیا تمھیں یاد نھیں ھے پیغمبر اکرم نے فرمایا ھے: نابالغ، پاگل اور.. پر سے فرائض معاف کردیے گئے ھیں؟ اس پر حضرت عمر نے ایک تکبیر کھی اور اپنا حکم واپس لے لیا۔

اس قسم کے ناحق فیصلے خلیفہ دوم کی زندگی کی تاریخ میں بھت ملتے ھیں۔ مرحوم علامہ امینی نے الغدیر کی چھٹی جلد میں احکام اسلام کے بارے میں خلیفہ کی نا آگاھی کے سو واقعات مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کئے ھیں اور ان کا نام "نوادر الاثر فی علم عمر" رکھا ھے۔

ان امور کے جائزہ سے صاف معلوم ھوتا ھے کہ اسلامی معاشرے کی قیادت ھرگز ایسے فرد کے ھاتھوں میں نھیں دی جاسکتی ھے جو کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کے سلسلے میں اتنا بھی نھیں جانتا ھو کہ دیوانہ اور پاگل پر کوئی فریضہ عائد نھیں ھوتا۔

کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ھے کہ لوگوں کی ناموس اور اسلامی سماج کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ھاتھوں میں دے دی جائے جو عاقل اور دیوانہ میں فرق نہ کرسکتا ھو؟

کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ھے کہ خدائے عادل لوگوں کی جان ومال کو ایک ایسے شخص کے سپرد کردے جو یہ بھی نہ جانتا ھو کہ عورت چہ ماہ میں بچے کو جنم دے سکتی ھے اور ایسی عورت پر بدکاری کی تھمت نھیں لگائی جاسکتی اور نہ اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا جاسکتا ھے؟ (98)

خلیفہ سوم کے معلومات کا معیار

الٰھی احکام کے بارے میں تیسرے خلیفہ کے معلومات بھی گزشتہ دو خلفاء سے زیادہ نھیں تھے

۔ان کے ذریعہ پیغمبر سے نقل کی گئی احادیث کی کل تعداد 146 سے زیادہ نھیں ھے(99) اسلام کے اصول وفروع کے سلسلے میں حضرت عثمان کی آگاھی بھت کم اور ناچیز تھی قارئین کرام کی آگاھی کے لئے اسلامی تعلیمات سے ان کی بے خبری کے سلسلہ میں صرف ایک اشارہ پر اکتفا کی جاتی ھے:

اسلام کے واضح احکام میں سے ایک حکم یہ ھے کہ مسلمان اور کافر کا خون برابر نھیں ھے اور پیغمبر اسلام نے اس سلسلے میں فرمایا ھے:

"لایقتل مسلم بکافرٍ"

کافر کو قتل کرنے پر مسلمان کو قتل نھیں کیا جا سکتا، بلکہ قاتل دیت ادا کرے گا۔

لیکن افسوس ھے کہ خلیفہ سوم کی خلافت کے دوران جب ایک ایسا واقعہ پیش آیا تو خلیفہ نے قاتل کو قتل کرنے کا حکم صادر کردیا پھر بعض اصحاب رسول کی یاد دھانی پر اپنے حکم کو بدلا (100)

خلیفہ سوم کی زندگی میں ایسے بھت سے نمونے ملتے ھیں ۔ بیان کو مختصر کرنے کیلئے ھم ان کی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ھیں اور ایک بار پھر بحث کے نتیجہ کی طرف آتے ھیں:

امت اسلامیہ کی مذھبی قیادت کے لئے الٰھی احکام سے متعلق وسیع علم اور معلومات کا مالک ھونا شرط ھے اور ایسا علم عصمت یعنی گناھوں سے محفوظ رھے بغیر ممکن نھیں ھے اور افسوس ھے کہ پھلے تینوں خلفاء اس لطف الٰھی سے محروم تھے۔

سولھویں فصل

پیغمبر کے صحابی، گناہ و خطا سے معصوم نہیں

شاید مھاجرین و انصار کے ایک گروہ پر ھماری تنقید سُنی برادری کے بعض افراد کیلئے تعجب کا

سبب بنے اور یہ سوچیں کہ یہ کیسے ممکن ھے ان حضرات کے قول وفعل کی عیب جوئی کر کے ان کو خطا کار قرار دیا جائے جبکہ قرآن مجید نے دو موقعوں پر ان کی ستائش کی ھے:

(وَالسَّابِقُونَ الاٴَوَّلُونَ مِنَ المُھَاجِرِینَ وَالاٴنْصَارِ وَالَّذِینَ اتَّبَعُوھُمْ بِإِحْسَٰنٍ رَضِیَ اللهُ عَنْھُمْ وَرَضُوا عَنْہ وَاٴعَدَّ لَھُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِی تَحْتَھَا الاٴنْھَارُ خٰلِدِینَ فِیھَآ اٴبَداً ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیمُ)

”اورمھاجرین وانصار میں سے سبقت کرنے والے اورجن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ھے، ان سب سے خدا راضی ھوگیا ھے اور یہ سب خدا سے راضی ھیں اور خدا نے ان کے لئے وہ باغات مھیّا کئے ھیں جن کے نیچے نھریں جاری ھیں اور یہ ان میں ھمیشہ رھنے والے ھیں اور یھی بھت بڑی کامیابی ھے“(101)

2۔ایک دوسرے سورہ میں ان افراد کے بارے میں،جنھوں نے سرزمین”حدیبیہ پر ایک درخت کے سایہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی تھی،یوں فرمایا ھے:

(لَقَدْ رَضِیَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِینَ إِذْ یُبَایِعُونَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِی قُلُوبِھِمْ فَاٴنْزَلَ السَّکِینَةَ عَلَیْھِمْ وَاٴثَابَھُمْ فَتْحاً قَرِیباً)

”یقینا خدا صاحبان ایمان سے اس وقت راضی ھوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رھے تھے پھر اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو ان کے دلوں میں تھا تو ان سب پر سکون نازل کر دیا اور انھیں اس کے عوض قریبی فتح عنایت کر دی“(102)

خلاصہ: پھلی آیہ کریمہ میں خدائے تعالیٰ مھاجرین وانصار میں سے ان افراد کی ستائش کرتا ھے جو دوسرے لوگوں سے پھلے اسلام لائے اس کے بعد ان افراد کی بھی تعریف کرتا ھے

جنهوں نے ان میں سے کسی ایک کی پیروی کی هو۔

دوسری آیہ شریفہ میں، خداوند کریم ان افراد کے بارے میں رضا مندی اورخوشنودی کا اظهار کرکے انهیں آرام وسکون اور فتح مکہ کی بشارت دیتا هے، جنهوں نے ساتویں هجری کوسرزمین "حدیبیہ" پر پیغمبرکی بیعت کی تهی۔

خدائے تعالیٰ کی طرف سے اس ستائش اوراظهارخوشنودی کے هوتے هوئے کس طرح ممکن هے کہ پیغمبراکرم کی رحلت کے بعدرسول کے اصحاب اپنے فیصلوں میں خطایا گناہ کے مرتکب هوتے هوں؟!

مذکورہ بالا آیات کے مقاصد کی وضاحت کرنے سے پهلے ایک مطلب کی طرف اشارہ کرنا ضروری هے اوروہ یہ هے کہ اهل سنت کے علماء نہ فقط ان دوگروهوں (مهاجرین وانصاراور تابعین) کو جن کے بارے میں ان دوآیتوں میں اشارہ هوا هے عادل اور پاک دامن جانتے هیں بلکہ ان کی اکثریت کا اعتقاد یہ هے کہ تمام اصحابِ رسول عادل، منصف، متقی اور پرهیزگار تهے۔مگر یہ کہ کسی ایک کے بارے میں کسی واقعہ میں فسق وانحراف ثابت هوجائے۔

مختصر یہ کہ جس کسی نے پیغمبراسلام کی مصاحبت کا شرف حاصل کیا هے اسے عادل اور پاک دامن جاننا چاهیئے، مگر یہ کہ اس کے برخلاف کچھ ثابت هوجائے۔

اس جملہ کا مفهوم یہ هے کہ پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں جن کی تعداد ایک لاکہ سے زیادہ هے، کے تانے بانے هی جدا هیں، یعنی جوں هی کوئی فرد پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کے حضور مشرف هوتا تھا، ایک روحانی انقلاب پیدا کر کے اس لمحہ کے بعد اپنی پوری زندگی میں صحیح، عادل اور پاک دامن هونے کی سند حاصل کر لیتا تھا۔

صحابیوں کے بارے میں ایسی بات کهنا، ان میں سے ایک گروہ کی بدکرداری پر پردہ ڈالنے کے مترادف هے، کیونکہ ایسے افراد کا ضعیف عمل اور بعض مواقع، جیسے، جنگ احد و جنگ حنین میں ان کا فرار کرنا ان کے ایمان میں کمزوری خود رسالت مآب اور آپ کے عالی مقاصد کے تئیں ان کی بے توجهی کی واضح دلیل هے قارئین کرام جنگ "احد" میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی بے وفائی کے بارے میں نازل شدہ آیات کی تحقیق کر کے حقیقت کو بخوبی محسوس کر سکتے هیں۔

یہ کس طرح کها جا سکتا هے کہ تمام صحابی عادل اور پاک دامن تھے، جبکہ قرآن مجید ان کے ایک گروہ کے حلقہ منافقین میں هونے کے بارے میں یوں فرماتا هے:

(وَ اِذْ یَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَ الَّذِینَ فِی قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللهُ وَ رَسُولُه إلّا غُرُوراً)

"اور جب منافقین اور جن کے دلوں میں مرض تھا، یہ کهہ رهے تھے کہ خدا اور اس کے رسول نے هم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سراسر دھوکہ هے" (103)

کیا ایسی بات کهنے والوں کو عادل و منصف کها جا سکتا هے؟ جبکہ ایسا کهنے والے کو حقیقی مسلمان بھی نهیں کها جا سکتا هے۔

قرآن مجید صحابہ کے ایک گروہ کا تعارف "سمّاعون" کی حیثیت سے کراتا هے۔

اس لفظ سے مراد وہ افراد تھے جو منافقین کی باتوں کو فوراً قبول کر لیا کرتے تھے، فرماتا هے:

(لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالاً وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ وَاللهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ)

اگر یہ (منافقین) تمھارے ساتھ نکل بھی پڑتے تو تمھاری وحشت میں اضافہ ھی کرتے اور تمھارے درمیان فتنہ کی تلاش میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے اور تم میں ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی باتوں کو خوب سننے والے تھے اور اللہ تو ظالمین کو اچھی طرح جانتا ھے۔(104)

اس گروہ کے تمام افراد کو کیسے عادل و پاک دامن جانا جاسکتا ھے، جبکہ خالد بن ولید (بعض اھل سنت مصنفین کے عقیدہ کے مطابق اس نے پیغمبر سے "سیف اللہ" کا لقب حاصل کیا تھا) فتح مکہ کے سال ایک خطرناک جرم کا مرتکب ھوا اور قبیلہ "بنی خزیمہ ***" کی ایک جماعت کو ضمانت اور عھد و پیمان کے بعد دھوکہ وفریب سے قتل عام کرڈالا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اس مجرمانہ حرکت کی خبر سنی تو قبلہ کی طرف رخ کرکے کھڑے ھوئے اور اپنے ھاتھوں کو بلند کرکے" استغاثہ کی حالت میں فرمایا:

"اللھم انّي ابرءُ اليك ممّا صنع خالد بن وليد"

خدا! جو کچھ خالد بن ولید نے انجام دیا ھے، میں اس سے بیزار ھوں۔(105)

اس نام نھاد "سیف اللہ" کے کارناموں کی سیاہ فائل یھیں پر بند نھیں ھوتی بلکہ پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد مالک بن نویرہ اور اس کے قبیلہ کے ساتھ کئے گئے اس کے بھیمانہ جرائم تاریخ کے صفحات میں ضبط ھوچکے ھیں۔ اس نے مالک کو جو ایک مسلمان تھا قتل کرڈالا اور اس کی بیوی کے ساتھ اسی شب اپنا منہ کالا کیا۔

حق وباطل پہچاننے کا راستہ

اصولی طور پر یہ سب سے بڑی غلطی ھے کہ ھم حق و باطل کو افراد کے ذریعہ پھچانیں اور ان کی رفتار وگفتار کی حقانیت کے لئے ان کی شخصیت کو معیار قرار دیں، جبکہ ایک شخص کا عقیدہ اور قول وفعل اس کی حقانیت کی علامت ھوتا ھے، نہ کہ برعکس۔

"بریٹنڈرسل" علم ریاضی کا ایک بڑا دانشور ھے اور ریاضیات میں اس کے نظریے نمایاں اور علماء کے لئے قابل قبول ھیں، لیکن اس کے باوجود وہ ایک ملحد ھے اور خدا والٰھی مقدسات کا منکر شمار ھوتا ھے، وہ اپنی کتاب "میں کیوں عیسائی نھیں ھوں" میں خدا پرستوں کے دلائل سے ناواقفیت کے سبب صراحت کے ساتھ لکھتا ھے:

"میں ایک زمانے میں خدا پرست تھا اور اس کی بھترین دلیل

"علة العلل"

جانتا تھا لیکن بعد میں اس عقیدہ سے پھر گیا۔ کیونکہ میں نے سوچا اگر ھر چیز کے لئے ایک علت اور خالق کی ضرورت ھے تو خدا کے لئے بھی ایک خالق ھونا چاھئے"(106)

کیا عقل ھمیں اس بات کی اجازت دیتی ھے کہ "رسل" کی شخصیت کو خدا کے بارے میں اس کے فاسد فلسفی نظریہ جبکہ کائنات کے تمام ذرات خدا کے وجود کی گواھی دیتے ھیں کے صحیح ھونے کی بنیاد قرار دیں؟ واضح ھے کہ ھمیں اپنے فیصلوں میں افراد کی علمی وسیاسی شخصیت سے متأثر نھیں ھونا چاھئے اور ان کے افکار واعتقاد اور قول وفعل کو ھر طرح کے حب وبغض سے اوپر اٹھ کر صرف عقل ومنطق کے معیار پر تولنا چاھئے۔

یهاں مناسب هے کہ هم اس موضوع کے بارے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے پائیدار اور مستحکم نظریہ کی طرف بھی اشارہ کردیں۔

جنگِ جمل میں کچھ لوگ حضرت علی (ع) کے طرفدار اور کچھ لوگ طلحہ، زبیر اور ام المؤمنین عائشہ کے طرفدار تھے۔اس حالت میں دودلی کا شکار ایک آدمی جو حضرت علی (ع) کی عظیم شخصیت سے بھی آگاہ تھا، آگے بڑھا اور بولا:

کیسے ممکن هے کہ یہ لوگ باطل پر هوں، جبکہ ان کے درمیان طلحہ، زبیر اور ام المؤمنین عائشہ جیسی شخصیتیں موجود هیں، کیا یہ کها جاسکتا هے کہ ان افراد نے باطل کا راستہ اختیار کیا هوگا؟!

امیر المؤمنین (ع) نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات بیان فرمائی کہ مصر کا مشهور دانشور ڈاکٹر طہٰ حسین اس کے بارے میں کهتا هے:

”وحی کا سلسلہ بند هونے کے بعد انسان کے کانوں نے اب تک ایسی باعظمت بات نهیں سنی هے“

امام (ع) نے فرمایا:

"انك لملبوس علیك، ان الحق و الباطل لا یعرفان باٴقدار الرجال، اعرف الحق تعرف اهله، اعرف الباطل تعرف اٴهله"

یعنی، تم نے حق و باطل کو پهچاننے کے معیار میں غلطی کی هے۔حق و باطل هرگز افراد کے ذریعہ نهیں پهچانے جاتے، بلکہ پهلے حق کو پهچاننا چاهئے پھر اهل حق کو پهچانا جاسکتا هے، پهلے باطل کو پهچاننا چاهئے پھر اهل باطل کی تمیز دی جاسکتی هے۔

امیر المؤمنین کی یہ عظیم فرمائش کہ بقول ڈاکٹر طہٰ حسین، وحی الٰهی کے بعد انسان کے کانوں

نے ایسا کلام نھیں سنا ھے بعض سنی علماء کے اس اصول کو پوری طرح بے بنیاد ثابت کرتا ھے کہ پیغمبر اسلام کے تمام اصحاب عادل ھیں۔

اب ھم یھاں پر قرآن مجید کی مذکورہ بالا دو آیتوں کے سلسلہ میں بحث کرتے ھیں۔

اس میں کوئی شک نھیں کہ پھلی آیت اس امر کی حکایت کرتی ھے کہ خدائے تعالیٰ دو گروھوں سے راضی ھوا ھے اوراس نے اپنی بھشت کوان کے لئے آمادہ کیا ھے۔ یہ دوگروہ حسب ذیل ھیں:

1۔ مھاجریں وانصار کا ایک گروہ، جنھوں نے ایمان اوراسلام لانے میں دوسرے لوگوں پر سبقت حاصل کی ھے اورنازک لمحات میں دین کی راہ میں قربانیاں دی ھیں۔

2۔ وہ لوگ جنھوں نے شائستہ طور پر مھاجریں وانصار کی پیروی کی ھے۔

قرآن مجید نے پھلے گروہ کے بارے میں (السَّابِقُونَ الاَوَّلُونَ) اور دوسرے گروہ کے بارے میں (وَالَّذِینَ اتَّبَعُوھُمْ بِاِحْسانِ) کی اصطلاح استعمال کی ھے۔

لیکن قابل غور امر یہ ھے کہ کیا، جو چیز ان سے خدا کی خوشنودی ورضا مندی کا سبب بنی صرف ان کی اسلام اور پیغمبر پر ایمان لانے میں سبقت تھی، اور کیا اس خوشنودی ورضا مندی کی بقاء و دوام بلا قید وشرط ھے؟

واضح تر الفاظ میں: کیا اگر یہ افراد بعد والے زمانوں میں فکری یا اختلافی انحراف کا شکار ھوکر ظلم و جبر کے مرتکب ھوجائیں، تو کیا پھر بھی وہ خدا کی رضا مندی اور خوشنودی کے حقدار ھوں گے اور قھر وغضب ان کے شامل حال نھیں ھوگا؟ یا یہ کہ اسلام لانے میں ان کی سبقت

کے لئے خدا کی رضا مندی اور خوشنودی کا باقی رھنا اس امر پر مشروط ھے کہ ان کا ایمان وعمل صالح ان کی زندگی کے تمام ادوار میں باقی رھے، اور اگر ان دو شرائط،، میں ان کی زندگی میں کبھی خلل پیدا ھو جائے تو ان کی اسلام میں سبقت اور مھاجر و انصار کے عنوان کا کوئی فائدہ نھیں ھوگا؟

قرآن مجید کی دیگر آیات کی تحقیق سے قطعی طور پر دوسرے نظریہ کی تائید ھوتی ھے کہ خدا کی طرف سے اپنے بندوں کے لئے کامیابی اور خوشنودی کی بقا اسی شرط پر ھے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ایمان اور عمل صالح پر قائم و دائم رھیں۔ ملاحظہ ھوں اس قسم کی چند آیات کے نمونے:

قرآن مجید سورہ حشر (107) میں مھاجرین کی ایک جماعت کی اس بات پر ستائش کرتا ھے کہ انھوں نے اپنا سب مال و منال چھوڑ کر مدینہ ھجرت کی تھی، اس کے بعد ان کی ستائش کا سبب مندرجہ ذیل عبارتوں میں بیان فرمایا ھے۔

(يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللهِ وَرِضْوَاناً وَيَنْصُرُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ)

وہ لوگ ھمیشہ خدا کے فضل و کرم اور اس کی مرضی کے طلبگار رھتے ھیں اور خدا اور رسول کی مدد کرنے والے ھیں۔

یہ آیہ شریفہ اس بات کی حکایت کرتی ھے کہ انسان کی نجات کے لئے ھجرت کرنا گھر بار اور مال و منال کو چھوڑنا ھی کافی نھیں ھے بلکہ خدا کی خوشنودی کے اسباب فراھم کرنے کی مسلسل کوشش کرنا اور اپنے نیک اعمال کے ذریعہ خدا اور اس کے رسول کی مدد کرنا بھی ضروری ھے۔

قرآن مجید فرماتا ھے: فرشتے، جو عرش کے اطراف میں خدائے تعالیٰ کی تسبیح کرتے ھیں، با ایمان افراد کے لئے اس طرح دعائے مغفرت کرتے ھیں:

(فَاغْفِرِ لِلَّذِين تَابُو وَ اتَّبَعُوا سَبِيلَكَ)

"خدایا! جو تیری طرف لوٹ آئے ھیں اور تیرے دین کی پیروی کرتے ھیں، انھیں بخش دے"

قرآن مجید اصحاب پیغمبر میں سے ان افراد کی ستائش کرتا ھے جو کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ھیں اور آپس میں مھربان ھیں، رکوع وسجود بجالاتے ھیں، خدا کے کرم وخوشنودی کے طالب ھیں اوران کے چھروں پر سجدوں کی نشانیاں نمایاں ھیں (108)

اس کے علاوہ قرآن عفو وبخشش اور عظیم اجر کا حقدار ان اصحاب رسول کو جانتا ھے جو خدا پر ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیتے ھیں (109)

مذکورہ آیات اوران کے علاوہ دیگر آیات اس بات کی گواہ ھیں کہ مھاجرین وانصار یا سابقین وتابعین کے عنوان، سعادت مند ونجات یافتہ ھونے کے لئے کافی شرط نھیں ھیں بلکہ اس فضیلت کے ضمن میں دیگر فضائل، جیسے نیک اعمال کی انجام دھی اور بُرے کاموں سے پرھیز کی شرط بھی ضروری ھے، ورنہ یہ لوگ درج ذیل آیات کے زمرے میں شامل ھوں گے:

1۔ (فَإِنَّ اللهَ لاَ يَرْضىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ)

خدائے تعالیٰ فاسقوں کے گروہ سے راضی نھیں ھوتا۔(110)

2۔ (وَ اللهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ)

خدائے تعالیٰ ظالموں کو دوست نھیں رکھتا۔(111)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمان کے بلند ترین مقام پر فائز اور فضیلت واخلاق کا نمونہ تھے، لیکن پھر بھی خدائے تعالیٰ واضح الفاظ میں آپ (ع) کو خبر دار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ) (112)

اگر تم شرک اختیار کرو گے تو تمھارے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے اور تمھارا شمار گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا"

بیشک پیغمبر اکرم کا قوی ایمان اور آپ کی عصمت ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کو شرک کی طرف مائل نھیں کرسکتی، لیکن یھاں پر قرآن مجید آپ سے مخاطب ہو کر درحقیقت دوسروں کو خبر دار کرتا ھے کہ چند نیک اعمال کے دھوکے میں نہ رھیں بلکہ کوشش کریں کہ زندگی کی آخری سانس تک اسی نیک حالت پر باقی رھیں۔

اس بنا پر ھمیں ھرگز یہ تصور نھیں کرنا چاھئے کہ پیغمبر کا صحابی ھونا اور سابقین وتابعین کے زمرے میں شمار ھونا کسی کو ایسا تحفظ بخش دے گا کہ اگر وہ بعد میں کوئی غلط قدم بھی اٹھائے، پھر بھی خدا کی خوشنودی کا مستحق قرار پائے گا۔

ان ھی مھاجرین اور انصار یا سابقین وتابعین میں سے بعض افراد خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں ھی مرتد ھوگئے تھے اور پیغمبر خدا کی جانب سے انھیں سخت ترین سزا کا حکم سنا دیا گیا، اس وقت کسی نے بھی اعتراض نھیں کیا کہ: اے پیغمبر! خداوند کریم ان سے راضی ھوگیا ھے، آپ انھیں کیوں یہ سخت سزا سنا رھے ھیں؟

اس سیاہ فہرست کے چند نمونے ملاحظہ ھوں:

1۔عبداللہ بن سعد بن ابی سرح: وہ مھاجرین میں سے تھا اور کاتب وحی تھا اس کے بعد مرتد ھوگیا اور اس نے کھا:

(سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللهُ)(113)

میں بھی خدا کی طرح کی باتیں نازل کرسکتا ھوں!

فتح مکہ میں پیغمبر اسلام نے چند افراد کے قتل کا حکم دیدیا اور فرمایا: جھاں کھیں وہ ملیں انھیں فوراً قتل کردیا جائے ، ان میں سے ایک یھی " عبداللہ" تھا ،لیکن فتح مکہ کے بعد اس نے حضرت عثمان کے وھاں پناہ لے لی ، کیونکہ وہ حضرت عثمان کا رضاعی بھائی تھا حضرت عثمان کی سفارش اور اصرار کے سبب پیغمبر اکرم نے اسے چھوڑ دیا۔

پیغمبر اس شخص سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ اس کو معاف کرنے کے بعد آنحضرت نے اپنے اصحاب سے فرمایا: جب تم لوگوں نے دیکھا کہ میں اسے معاف کرنے سے انکار کررھا ھوں اس وقت تم لوگوں نے اسے قتل کیوں نھیں کرڈالا؟(114)

2۔عبید اللہ بن جحش: وہ اسلام کے سابقین اور مھاجرین حبشہ میں سے تھا،لیکن حبشہ ھجرت کرنے کے بعد اسلام چھوڑ کر اس نے عیسائی دین قبول کرلیا۔

3۔حکم بن عاص: وہ ان لوگوں میں سے تھا جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے،لیکن پیغمبر اسلام نے چند وجوھات کی بنا پر اسے طائف جلا وطن کردیا۔

4۔حرقوص بن زھیر: اس نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی،لیکن غنائم کی تقسیم پر اس نے

پیغمبر اسلام سے تند کلامی کی اس پر رحمۃ للعالمین پیغمبر برھم ھو گئے اور فرمایا: وائے ھو تم پر، اگر میں انصاف وعدالت کی رعایت نہ کروں گا تو کون انصاف کرے گا؟! اس کے بعد اس کے خطرناک مستقبل کے بارے میں فرمایا: حرقوص ایک ایسے گروہ کا سردار بنے گا جو دین اسلام سے اسی طرح دور ھو جائیں گے جس طرح کمان سے تیر نکل کر دور جاتا ھے“(115)

پیغمبر اسلام کی یہ پیشین گوئی آپ کی رحلت کے سالھا بعد حقیقت ثابت ھوئی۔ یہ شخص خوارج کا سردار بنا اور جنگ نھروان میں حضرت علی (ع) کی تلوار سے قتل ھوا۔

یہ اس سیاہ فھرست کے چند نمونے تھے جس میں بھت سے اصحاب پیغمبر (مھاجر و انصار) موجود ھیں۔ پیغمبر اسلام کے صحابیوں کی تحقیق کے دوران ھمیں چند دوسرے افراد بھی نظر آتے ھیں: جیسے: حاطب بن ابی بلتعہ، جو اسلام کے خلاف جاسوسی کرتا تھا یا ولید بن عقبہ، جسے قرآن مجید نے سورہ حجرات (116) میں فاسق کھا ھے یا خالد بن ولید، جس کا نامہ اعمال اس کے کالے کرتوتوں سے بھرا پڑا ھے(117)

کیا صحابیوں میں ایسے افراد کی موجودگی کے باوجود بھی یہ کھا جاسکتا ھے کہ خدائے تعالیٰ سابقین اور تابعین سے راضی ھو چکا ھے اب کسی کو بھی ان کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھنے کا حق نھیں ھے؟!

مختصر یہ کہ خدا کی رضا وخوشنودی، ان کے عمل سے مربوط ھے، یعنی خدائے تعالیٰ ان افراد سے راضی وخوشنود ھوا ھے، جنھوں نے غربت کے زمانے میں اسلام اور رسول خدا کی حمایت ومدد کی ھے لیکن اس قسم کی خوشنودی کا اظھار اس بات کی دلیل نھیں ھے کہ ان کی یہ

خوشنودی ان افراد کی زندگی کی آخری سانس تک باقی رهے گی ۔ بلکه اس کی بقا کی شرط یه هے که ان کا ایمان اسی حال میں باقی رهے اور وه ایسا کوئی کام انجام نه دیں جو ان کے کفر، ارتداد ،فسق اور اعمال صالح کے برباد هوجانے کا سبب بنے ۔

دوسرے الفاظ میں ، مهاجرین وانصار کا ایمان و اخلاص ، بھی دوسرے نیک اعمال کی طرح اس پر مشروط هے که بعد میں کوئی ایسا کام انجام نه دیں جو ان کے اس عمل کو بے اثر بنا کر دے ورنه ان کا یه نیک عمل باقی نه رهے گا ۔ علماء کی اصطلاح میں جس پاداش کا اس آیت میں ذکر هوا هے (رضا مندی وبهشت) یه ایک "نسبی" پاداش هے ۔ یعنی وه اس لحاظ سے ایسی پاداش کے حقدار هیں لیکن اس سے بھی انکار نهیں هے که اگر یهی لوگ بعد میں خدا کی نافرمانی کے کام انجام دیں گے تو غضب الهی اور جهنم کے مستحق هوجائیں گے ۔ اس قسم کی آیات کا هرگز یه مطلب نهیں هے که پیغمبر اسلام صلی الله علیه وآله وسلم کے سابق صحابیوں کو تحفظ بخش دیں چونکه خداوند تعالیٰ ان سے خوشنود هوگیا هے ، لهذا وه جو چاهیں انجام دیں یا ان میں سے اگر کوئی کسی غیر شرعی کام کا مرتکب هوگیا هو تو هم اس آیت کے حکم کی تاویل وتحریف پر مجبور هوں کیونکه اس آیت نے ان کے سلسلے میں قطعی حکم صادر کردیا هے!

نهیں ایسی ضمانت انبیاء اور اولیاء میں بھی کسی کو نهیں ملی هے حتی خود رسول خدا صلی الله علیه وآله وسلم کو بھی ایسی ضمانت نهیں ملی هے ۔

قرآن مجید حضرت ابراهیم (ع) اور ان کے فرزندوں جیسے اسحاق (ع)، یعقوب (ع)، موسی (ع) وهارون (ع) وغیره کے بارے میں فرماتا هے:

(وَلَوا َ َ شْرَکُوالَحَبِطَ عَنْھُم مَا کَانُوایَعْمَلُونَ)(118)

اگر یہ لوگ شرک اختیار کر لیتے تو ان کے سارے اعمال بر باد ھو جاتے“

سترھویں فصل

حضرت علی(ع)کی پیشوائی کے نقلی دلائل

گزشتہ بحثوں میں یہ ثابت ھوا کہ خدا کی طرف سے امام کا تعین دنیاوی ”مطلق العنان“ نظام سے بالکل مختلف ھے،لوگوں میں قوانین الٰھی کی روشنی میں حکم کرنے اور انصاف قائم کرنے

کے لئے جو حاکم خدا کی طرف سے معین ھوتا ھے، اس کی حکومت روئے زمین پر قابل تصور حکومتوں میں سب سے زیادہ عادل اور مستحکم حکومت ھے۔

اس قسم کی حکومت میں، حاکم وفرماں روا خدا کی طرف سے منتخب ھوتا ھے۔ خدا بھی اپنے حکیمانہ ارادہ سے ھمیشہ بھترین وشائستہ ترین فرد کو رھبر کے عنوان سے منتخب کرتا ھے اور خدا کے علم وتشخیص میں کسی بھی قسم کی غلطی وخطا یا غیر منطقی میلان کا امکان نھیں پایا جاتا۔

خدائے تعالیٰ انسان کے بارے میں مکمل آگاھی رکھتا ھے اور اپنے بندوں کے بارے میں ان کی مصلحتوں اور ضرورتوں سے ان سے زیادہ واقف ھے۔ جس طرح خدا کے قوانین اور احکام بھترین اور عالی ترین قوانین واحکام ھیں اور کوئی بھی قانون خدا کے قانون کے برابر نھیں ھے، اسی طرح خدا کی طرف سے معین شدہ پیشوا اور رھبر بھی بھترین پیشوا اور شائستہ ترین ورھبر ھوگا ایک ایسا قائد وفرمان روا جس کی زندگی دسیوں سھو وخطا اور نفسانی خواھشات سے آلودہ ھو وہ خدا کی طرف سے منتخب شدہ رھبر وقائد کا ھم پلہ ھرگز نھیں ھوسکتا ھے۔

گزشتہ بحثوں میں یہ بھی ثابت ھوا کہ اسلامی معاشرہ ھمیشہ ایک ایسے معصوم امام کا محتاج ھے جو الٰھی قوانین اور احکام سے آگاہ ھوتا ھے، کہ امت کے لئے فکری اور علمی پناہ گاہ بن سکے۔

اصولی طور پر اسلامی معاشرہ فکری اور علمی لحاظ سے ارتقاء کی اس حد تک نھیں پھنچا تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اپنا نظم ونسق خود سنبھال سکے اور اس قسم کے ایک الٰھی رھبر سے بے نیا ھوجائے۔

اب ھم غور کریں اور دیکھیں کہ ان تمام حالات کے تناظر میں پیغمبر الٰھی نے اسلامی امت کی

قیادت کے لئے کس کو معین فرمایا تھا اور اس مسئلہ کو ھمیشہ کے لئے حل کر دیا تھا۔
یھاں پر ھم ایسے نقلی دلائل کا سھارا لیتے ھیں وہ دلائل جو قطعی طور سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صادر ھوئے اور اصطلاحاً متواتر ھیں اور ان میں جھوٹ اور جعل سازی کا ھرگز امکان نھیں ھے۔ اس کے علاوہ ایسی روایتوں کا مفاد یہ ھے کہ ان، کی دلالت کسی خاص فرد یا افراد کی امامت و پیشوائی کے بارے میں اتنی واضح اور روشن ھو کہ ھر قسم، کے شک وشبھہ کو دلوں سے نکال دے اور کسی بھی انصاف پسند انسان کے لئے سوال اور تذبذب کی گنجائش باقی نہ رھے۔
لھذا ھم یھاں پر چند ایسے نقلی دلائل کی طرف اشارہ کریں گے جن کی روایت پیغمبر اکرم سے قطعی اور مقصود کے بارے میں ان کی دلالت بھی واضح ھے۔ کتاب کے صفحات اور قارئین کرام کے وقت کی کمی کے پیش نظر ھم یھاں لوگوں پر امیر المؤمنین (ع) کی پیشوائی وولایت کے سلسلے میں نقل ھوئے دلائل کی ایک بڑی تعداد میں سے حسب ذیل کا انتخاب کرتے ھیں:

1۔ حدیث منزلت

شام کی طرف سے آنے والے تاجروں کے ایک قافلہ نے حجاز میں داخل ھونے کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر دی کہ روم کی فوج مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رھی ھے کسی حادثہ کے بارے میں حفظ، ماتقدم اس کے مقابلے سے بھتر ھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں فوجی آمادگی کا اعلان ھوا۔

مدینہ منورہ میں سخت گرمی کا عالم تھا، پھل پکنے اور فصل کاٹنے کا موسم تھا، اس کے باوجود تیس ھزار شمشیر زن اسلام کی چھاؤنی میں جمع ھوگئے اور اس عظیم جھاد میں شرکت پر آمادگی کا اعلان کیا۔

چند مخبروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر دی کہ مدینہ کے منافق منصوبہ بندی کررھے ھیں کہ آپ کی عدم موجودگی میں مدینہ میں بغاوت کرکے خون کی ھولی کھیلیں گے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ھر قسم کے حادثہ کی روک تھام کے لئے حضرت علی (ع) کو اپنا جانشین مقرر فرما کر انھیں حکم دیا کہ آپ مدینہ میں ھی رھیں اور میری واپسی تک حالات پر نظر رکھیں اور لوگوں کے دینی و دنیاوی مسائل کو حل کریں۔

جب منافقین حضرت علی علیہ السلام کے مدینہ میں رھنے کی خبر سے آگاہ ھوئے، تو انھیں اپنی سازشیں ناکام ھوتی نظر آئیں۔ وہ کسی اور تدبیر میں لگ گئے وہ چاھتے تھے کہ کوئی ایسا کام کریں جس سے حضرت علی علیہ السلام مدینہ سے باھر چلے جائیں۔ لھذا انھوں نے یہ افواہ پھیلادی کہ حضرت علی (ع) اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان رنجش پیدا ھوگئی ھے اسی لئے پیغمبر نے علی (ع) کے ساتھ یہ سلوک کیا ھے کہ انھیں اس اسلامی جھاد میں شرکت کرنے کی اجازت نھیں دی!

مدینہ میں حضرت علی (ع) کے بارے میں جو روز پیدائش سے ھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مھر و محبت کے سائے میں پلے بڑھے اس قسم کی افواہ کا پھیلنا، حضرت علی (ع) اور آپ (ع) کے دوستوں کے لئے شدید تکلیف کا سبب بنا۔ لھذا حضرت

علی (ع)اس افواہ کی تردید کے لئے مدینہ سے باھر نکلے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پھنچے، جو ابھی مدینہ منورہ سے چند میل کی دوری پر تھے آپ (ع) نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کواس واقعہ سے آگاہ فرمایا۔ یھاں پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے تئیں اپنے بے پایاں جذبات اور محبت کا اظھار کرتے ھوئے آپ کے مقام ومنزلت کودرج ذیل تاریخی جملہ میں بیان فرمایا:

"اما ترضی ان تکون منّی بمنزلة ھارون من موسیٰ، الّا انہ لا نبیّ بعدی، انّہ لا ینبغی ان اذھب الّا و انت خلیفتی"

" یعنی کیا تم اس پر راضی نھیں ھو کہ تمھیں مجھ سے وھی نسبت ھے جیسی ھارون (ع) کو موسی (ع) سے تھی، بس فرق یہ ھے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نھیں ھوگا؟ میرے اس دنیا سے جانے کے بعد تم ھی میرے جانشین اور خلیفہ ھوگے"

یہ حدیث جو اسلامی محدثین کی اصطلاح میں حدیث "منزلت" کے نام سے مشھور ھے متواتر اور قطعی احادیث میں سے ھے۔

مرحوم محدث بحرانی نے کتاب" غایة المرام" میں ان افراد کا نام ذکر کیا ھے، جنھوں نے اس حدث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ھے اور ایک دقیق وصحیح تحقیق سے ثابت کیا ھے کہ اسلامی محدثین نے اس حدیث کو 150 طریقوں سے نقل کیا ھے جن میں 100 طریقے اھل سنت علماء ومحدثین تک منتھی ھوتے ھیں (119)

مرحوم شرف الدین عاملی نے بھی کتاب "المراجعات" میں اس حدیث کے اسناد کو اھل سنت محدثین کی کتابوں سے نقل کیا ھے اور ثابت کیا ھے کہ یہ حدیث ان کی دس حدیث اور رجال

کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے"(120)

اس حدیث کے صحیح ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اہل سنّت کے صحاح لکھنے والوں "بخاری" اور "مسلم" نے بھی اسے اپنی صحاح میں ذکر کیا ہے(121) اس حدیث کے محکم ہونے کے بارے میں یہی کافی ہے کہ امیر المؤمنین کے دشمن "سعد و وقاص" نے اسے حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کی تین نمایاں فضیلتوں میں سے ایک فضیلت شمار کیا ہے۔

جب معاویہ اپنے بیٹے "یزید" کے حق میں بیعت لینے کے لئے مکہ میں داخل ہوا، اور "الندوۃ" کے مقام پر ایک انجمن تشکیل دی جس میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے بعض شخصیتیں جمع ہوئیں۔ معاویہ نے اپنی تقریر کا آغاز ہی حضرت علی (ع) کو برا بھلا کہنے سے کیا، اسے امید تھی، کہ "سعد و وقاص" بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا۔ لیکن سعد نے معاویہ کی طرف رخ کر کے کہا: جب بھی مجھے حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے تین درخشان کارنامے یاد آتے ہیں تو صدق دل سے کہتا ہوں کہ کاش! ان تین فضیلتوں کا مالک میں ہوتا! اور یہ تین فضیلتیں حسب ذیل ہیں:

1۔ جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے کہا:

"تمھیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ھارون کو موسیٰ (ع) سے تھی، بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا"

2۔ (پیغمبر اکرم نے) جنگ خیبر کے دوران ایک دن فرمایا:

"کل میں علم ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جسے خدا و رسول دوست رکھتے ہیں اور وہ فاتح

خیبر ھے۔فرار کرنے والانھیں ھے“ (اس کے بعد آنحضرت نے علم علی (ع) کے ھاتہ میں دیدیا)۔

3۔”نجران“ کے عیسائیوں کے ساتھ مباھلہ کے دن پیغمبر اکرم نے علی (ع)، فاطمہ (ع)، حسن (ع)، وحسین (ع) کو اپنے گرد جمع کیا اور فرمایا:

”پروردگارا! یہ میرے اھل بیت (ع) ھیں“(122)

لھذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس حدیث کے بیان کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نھیں کرنا چاھئے ، بلکہ ایک قدم آگے بڑہ کر اس حدیث کی دلالت ، مفھوم اور مقصد کے بارے میں قدرے غور کرنا چاھئے۔

پچھلے مرحلہ میں جملہ ”الّا انہ لا نبی بعدی“ قابل غور ھے کہ اصطلاح میں اسے ”جملہ استثنائی“ کھا جاتا ھے، معمولاً جب کسی کی شخصیت کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ تشبیہ دیتے ھیں اور کھا جاتا ھے کہ یہ دونوں مقام ومنزلت میں ھم پلہ ھیں، تو اھل زبان اس جملہ سے اس کے سوا کچھ اور نھیں سمجھتے ھیں کہ یہ دو افراد اجتماعی شأن ومنصب کے لحاظ سے آپس میں برابر ھیں ۔ اگر ایسی تشبیہ کے بعد کسی منصب ومقام کو استثناء قرار دیا جائے تو وہ اس امر کی دلیل ھوتا ھے کہ یہ دو افراد اس استثناء شدہ منصب کے علاوہ ھر لحاظ سے ایک دوسرے کے ھم رتبہ ھیں۔

اس حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات سے حضرت علی علیہ السلام کی نسبت کو حضرت ھارون (ع) کو، حضرت موسی (ع) سے نسبت کے مانند بیان فرمایا ھے، اورصرف ایک منصب کو استثناء قرار دیا ھے، وہ یہ ھے کہ حضرت ھارون (ع) پیغمبر تھے لیکن

پیغمبر اسلام چونکہ خاتم النبیین هیں لهذا آپ (ع) کے بعد کوئی پیغمبر نهیں هوگا ۔ اور علی (ع) پیغمبری کے مقام پر فائز نهیں هوں گے۔

اب دیکھنا یہ هے کہ قرآن مجید کے حکم کے مطابق حضرت هارون (ع) کے پاس وہ کون سے منصب تھے کہ حضرت علی (ع) (بجز نبوت کے کہ خود پیغمبر نے اس حدیث کے ضمن میں اسے استثناء قرار دیا هے) ان کے مالک تھے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے همیں معلوم هوتا هے کہ حضرت موسیٰ نے خدائے تعالی سے حضرت هارون کے لئے درج ذیل منصب چاهے تھے اور خدا نے حضرت موسی (ع) کی درخواست منظور فرما کر وہ تمام منصب حضرت هارون (ع) کو عطا فرمائے تھے:

1۔ وزارت کا عهدہ: حضرت موسیٰ بن عمران (ع) نے خدائے تعالیٰ سے درخواست کی کہ حضرت هارون (ع) کو ان کا وزیر قرار دے:

(وَاجْعَلْ لِی وَزِیراً مِنْ اَهْلِی، هَارُونَ اَخِی)

"پروردگارا! میرے اهل بیت میں سے میرے بھائی هارون کو میرا وزیر قرار دیدے"

(123)

2۔ تقویت و تائید: حضرت موسیٰ (ع) نے خدا سے درخواست کی کہ ان کے بھائی حضرت هارون (ع) کے ذریعہ ان کی تائید وتقویت فرمائے:

(اُشْدُدْ بِهِ اَزْرِی)

اس سے میری پشت کو مضبوط کردے (124)

3۔ رسالت کا عهدہ: حضرت موسی (ع) بن عمران نے خدائے تعالی سے درخواست کی کہ

حضرت هارون (ع) کوامر رسالت میں ان کا شریک قرار دے:

(وَ أَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي) (125)

اسے امر رسالت میں میرا شریک قرار دیدے۔

قرآن مجید اشارہ فرماتا هے کہ خدائے تعالیٰ نے حضرت موسی (ع) کی تمام درخواستوں کا مثبت جواب دیکر یہ تمام عهدے حضرت هارون (ع) کوعطا کئے:

(قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ) (126)

یعنی اے موسی (ع)! بیشک تمهارے تمام مطالبات تمهیں عطا کردیے گئے اس کے علاوہ حضرت موسیٰ (ع) نے اپنی غیبت کے دوران بنی اسرائیل میں حضرت هارون (ع) کواپنا جانشین مقرر کرتے هوئے فرمایا:

(وَ قَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي)

یعنی، موسی نے هارون سے کها: تم قوم میں میرے خلیفہ وجانشین هو۔ (127)

مذکورہ آیات کا مطالعہ کرنے پر هارون (ع) کے منصب اور عهدے بخوبی معلوم هوتے هیں اورحدیث منزلت کی رو سے مقام نبوت کے علاوہ یہ سب منصب اور عهدے حضرت علی علیہ السلام کے لئے ثابت هونے چاهئیں۔

اس صورت میں حضرت علی (ع)، امام، وزیر، ناصر و مدد گار اور رسول خدا (ع) کے خلیفہ تھے اور پیغمبر کی عدم موجودگی میں لوگوں کی رهبری وقیادت کے عهدہ دار تھے۔

ایک سوال کا جواب:

ممکن ھے یہ کھا جائے کہ حضرت علی علیہ السلام کے لئے پیغمبر اکرم کی جانشینی انھیں ایام سے مخصوص تھی جب آپ مدینہ سے باھر تشریف لے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ نھیں ھے کہ حضرت علی (ع) پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد آپ کے مطلق خلیفہ اور جانشین تھے۔

لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ایک سرسری مطالعہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ھوجاتا ھے۔

ایک: حضرت علی علیہ السلام پھلے اور آخری شخص نھیں تھے۔ جنھیں پیغمبر اکرم نے اپنی عدم موجودگی میں مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیا ھو۔ بلکہ پیغمبر اکرم مدینہ منورہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران، جب کبھی مدینہ سے باھر تشریف لے جاتے تھے تو کسی نہ کسی شخص کو اپنی جگہ پر جانشین مقرر کرکے ذمہ داریاں اسے سونپتے تھے اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جملہ کے ذریعہ امام (ع) کو ھارون سے تشبیہ دینے کا مقصد صرف آپ (ع) کے مدینہ میں عدم موجودگی کے دوران امام (ع) کی جانشینی تھا، تو پیغمبر اسلام نے یہ جملہ اپنے دیگر جانشینوں کے لئے کیوں نھیں فرمایا، جبکہ وہ لوگ بھی جب پیغمبر جھاد یا حج خانہ خدا کے لئے مدینہ سے باھر تشریف لے جاتے، آپ کے جانشین ھوا کرتے تھے؟ پھر اس فرق کا سبب کیا تھا؟

دو: ایک مختصر مدت کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کرنے کی صورت میں پیغمبر کو اس طرح تفصیلی جملہ بیان کرکے منصب رسالت کو اس سے مستثنیٰ قرار دینے کی

ضرورت ھی نھیں تھی!

اس کے علاوہ اس قسم کی جانشینی کسی خاص فخر کا سبب نہ ھوتی اور اگر فرض کرلیں کہ یہ ایک اعزاز تھا تو اس صورت میں یہ چیز حضرت علی (ع) کے خاص فضائل میں شمار نھیں ھوتی کہ برسوں کے بعد سعد وقاص اس فضیلت کو سیکڑوں سرخ اونٹوں کے عوض خریدنے کی تمنا کرتا! اور خود حضرت علی (ع) کے انتھائی اھم فضائل (فاتح خیبر اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مباھلہ میں نفس پیغمبر اور آپ کے اھل بیت (ع)) کے مقام تک پھنچنے کی آرزو کرتا!!

تین: اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف جنگ تبوک کے لئے جانے کے موقع پر اس تاریخی جملہ کو بیان فرمایا ھوتا تو کسی کے ذھن میں ایسا سوال پیدا ھونا بجا تھا۔ لیکن پیغمبر اسلام نے امام علی علیہ السلام کے بارے میں یہ اھم جملہ دیگر مواقع پر بھی فرمایا ھے اور تاریخ اور حدیث کے صفحات میں یہ واقعات ثبت وضبط ھو چکے ھیں۔ ھم یھاں پر اس کے صرف دو نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ھیں

(وَجَعَلْنَا مَعَہ اَخَاہ ھٰرُونَ وَزِیراً)

ھم نے موسی کے بھائی ھارون کو ان کا ویز رقرار دیا" (128)

1۔ ایک دن حضرت ابو بکر، عمر اور ابوعبیدۃ بن جراح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو حضرت علی علیہ السلام کے شانہ پر رکھ کر فرمایا:

"یا علی انت اول المؤمنین ایماناً و اوّلھم اسلاماً، و انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" (129)

”اے علی! تم وہ پهلے شخص هو جو مجھ پر ایمان لائے اور دین اسلام کو قبول کیا اور تم کو مجھ سے وهی نسبت هے جو هارون کو موسیٰ سے تھی“

2۔ هجرت کے ابتدائی ایام میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مهاجرین وانصار کو جمع کیا اور انھیں آپس میں ایک دوسرے کا بھائی بنایا صرف حضرت علی علیہ السلام کو کسی کا بھائی قرار نہ دیا۔ حضرت علی (ع) کی آنکھوں میں آنسو آگئے، آپ (ع) نے پیغمبر سے عرض کی: یارسول اللہ! کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد هوئی هے کہ آپ نے هر فرد کے لئے ایک بھائی معین فرمایا، اور میرے لئے کسی کا انتخاب نهیں کیا؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یهاں پر صحابیوں کے مجمع میں اپنا وهی تاریخی جملہ دهرایا:

" وَ الّذی بعثنی بالحق ما اخرتك الا لنفسی و انت منی بمنزلة هارون من موسی غیر انه لا نبیّ بعدی و انت اخی و وارثی " (130)

”قسم اس خدا کی جس نے مجھے حق پر مبعوث فرمایا هے، میں نے تمهیں صرف اپنا بھائی بنانے بنانے کیلئے یہ تاخیر کی هے، اور تم کو مجھ سے وهی نسبت هے جو هارون (ع) کو موسی (ع) سے تھی، بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نهیں هوگا، تم میرے بھائی اور میرے وارث هو“ (131)

حضرت علی (ع) ان تمام عهدوں اور منصبوں کے مالک تھے جو حضرت هارون (ع) کو ملے تھے اس بات کی ایک اور دلیل یہ هے کہ پیغمبر اسلام خدا کے حکم سے مختلف طریقوں سے کوشش فرماتے تھے کہ لوگ اس سے آگاہ هوجائیں کہ حضرت علی (ع) کی حیثیت آپ کی نسبت وهی هے جو هارون (ع) کی موسی (ع) کی بنسبت تھی اور نبوت کے علاوہ اس میں

کسی اور قسم کی کمی نهیں هے۔

لهذا جب حضرت زهرا علیها السلام سے حضرت علی علیہ السلام کے دو بیٹے پیدا هوئے، تو پیغمبر نے علی (ع) کو حکم دیا کہ ان کے نام " حسن (ع) و حسین (ع)" رکھیں جیسا کہ هارون (ع) کے بیٹوں کے نام "شبر و شبیر" تھے کہ عربی زبان میں ان کا مطلب حسن و حسین هوتا هے۔

ان دو جانشینوں (یعنی حضرت علی (ع) اور حضرت هارون (ع)) کے بارے میں تحقیق و جستجو سے چند دیگر مشابهتوں کا سراغ بھی ملتا هے هم یهاں پر ان کے ذکر سے صرف نظر کرتے هیں، مرحوم شرف الدین نے کتاب "المراجعات" میں اس سلسلے میں مفصل بحث کی هے۔(132)

اٹھارهویں فصل

حدیث غدیر (پهلا حصه)

اسلام کی عالمی تحریک، ابتداء سے هی قریش بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے عام بت پرستوں کی طرف سے جنگ اور مخالفتوں سے روبرو هوئی۔ جو گونا گوں سازشوں کے ذریعہ اس شمع الٰهی کو بجھانے کے درپے تھے، لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کرسکے۔

ان کی آخری خیالی امید یہ تھی کہ اس عظیم تحریک کے پائے اس کے پیشوا اور بانی کی وفات کے بعد اس طرح ڈھہ جائیں گے جس طرح پیغمبر سے پہلے بعض لوگوں کی یکتا پرستی کی دعوت ان کی وفات کے بعد خاموش ھوگئی۔ (133)

قرآن مجید جس نے اپنی بھت سی آیات میں ان کی سازشوں اور منصوبوں سے پردہ اٹھایا تھا اس دفعہ بت پرستوں کی آخری خیالی امید یعنی وفات پیغمبر کے بارے میں درج ذیل آیت میں اشارہ فرماتا ھے:

(اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ { قُلۡ تَرَبَّصُوۡا فَاِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُتَرَبِّصِیۡنَ { اَمۡ تَاۡمُرُہُمۡ اَحۡلَامُہُمۡ بِہٰذَاۤ اَمۡ ہُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ) (134)

”یا یہ لوگ یہ کھتے ھیں کہ پیغمبر شاعر ھے اور ھم اس کی موت کا انتظار کررھے ھیں۔ تو آپ کھہ دیجئے کہ بیشک تم انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ھوں! کیا ان کی خام عقلیں انھیں اس بات پر آمادہ کرتی ھیں یا وہ واقعاً سرکش قوم ھیں“

مناسب ھے کہ یھاں پر بت پرستوں کی طرف سے رسالتماب کے ساتھ چھیڑی گئی بعض خائنانہ جنگوں اور روڑے اٹکانے کی منحوس حرکتوں کی ایک فھرست بیان کی جائے اور اس کے بعد دیکھا جائے کہ خدائے تعالیٰ نے ان کی آخری امیدوں کو کیسے ناکام بنایا اور آغوش پیغمبر میں حضرت علی (ع) جیسے لائق و شائستہ شخص کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کی حیثیت سے منتخب کرکے ان کی سازشوں کو خاک میں ملا دیا۔

1۔تھمت کا حربہ

کفار مکہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شاعر، کاھن، دیوانہ اور جادوگر ھونے کی تھمتیں لگا کر یہ کوشش کی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے اثرات کم کریں، لیکن سماج کے مختلف طبقوں میں اسلام کی نمایاں ترقی نے ثابت کردیا کہ آپ کی مقدس ذات ان تھمتوں سے بالاتر تھی۔

2۔آپ کے پیروؤں کو آزار پھچانا

کفار مکہ کا ایک اور منصوبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرؤوں کو آزار پھنچانا اور انھیں جسمانی اذیتیں دینا اور قتل کرنا تھا تاکہ آپ کے ارشادات وھدایت کے وسیع اثرات کو روک سکیں۔لیکن پیغمبر کے حامیوں کی ھر ظلم و جبر اور اذیت وآزار کے مقابلے میں استقامت و پامردی نے قریش کے سرداروں کو اپنے منحوس مقاصد تک پھنچنے میں ناکام بنادیا۔آنحضرت کے حامیوں کی آپ کے تئیں والھانہ عقیدت واخلاص نے دشمنوں کو حیرت زدہ کردیا،حتی ابو سفیان کھتا تھا،"میں نے قیصر وکسریٰ کو دیکھا ھے لیکن ان میں سے کسی کو اپنے پیرؤوں کے درمیان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا باعظمت نھیں دیکھا جن کے پیرؤوں نے ان کے مقاصد کی راہ میں اس قدر جاں بازی اور فداکاری کا ثبوت دیا ھے(135)

3۔عرب کے بڑے داستان گو کو دعوت

قرآن مجید کے روحانی اور جذباتی اثرات سے کفار قریش حیرت زدہ تھے اور تصور کرتے تھے کہ قرآن مجید کی آیات کو سننے کے لئے لوگوں کا پروانہ وار دوڑنا اس سبب سے ھے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام کی داستانیں اور کھانیاں بیان ھوئی ھیں۔ اس لئے کفار مکہ نے دنیائے عرب کے سب سے مشھور داستان گو "نصر بن حارث" کو دعوت دی کہ وہ خاص موقعوں پر مکہ کی گلی کوچوں میں 'ایران" اور "عراق" کے بادشاھوں کے قصے سنائے تا کہ اس طرح لوگوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مائل ھونے سے روک سکیں! یہ منصوبہ اس قدر احمقانہ تھا کہ خود قریش یہ داستانیں سننے سے تنگ آ چکے تھے اور اس سے دور بھاگتے تھے۔

4۔قرآن مجید سننے پر پابندی

قریش کا ایک اور منحوس منصوبہ قرآن مجید سننے پر پابندی عائد کرنا تھا اس شمع الٰھی کے پروانوں کی استقامت سے ان کا یہ منصوبہ بھی خاک میں مل گیا۔قرآن مجید کی زبردست شیرینی اور دلکشی نے مکہ کے لوگوں کو اس قدر فریفتہ بنا دیا تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں گھروں سے نکل کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے اطراف میں چھپ جاتے تھے تا کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز شب اور تلاوت قرآن مجید کے لئے اٹھیں تو وہ قرآن کی تلاوت سن سکیں۔قریش کے کفار صرف لوگوں کو قرآن سننے سے ھی منع نھیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کو پیغمبر سے ملنے جلنے سے منع کرتے تھے۔ جب عرب کی بعض بزرگ شخصیتیں جیسے، اعشی وطفیل بن عمر پیغمبر سے ملنے کے لئے مکہ میں آئے تو قریش نے مختلف ذرایع سے ان کو

پیغمبر تک پہنچنے سے روک دیا(136)

5۔اقتصادی پابندی

کفار قریش نے ایک دستور کے ذریعہ لوگوں میں یہ اعلان کیا کہ کسی کو بنی ھاشم یا محمد کے طرفداروں کے ساتھ لین دین کرنے کا حق نھیں ھے۔جس کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے ساتھیوں اور اعزّہ کے ساتھ "شعب ابی طالب (ع)" میں پورے تین سال تک انتھائی سخت اور قابل رحم زندگی گزارنے پر مجبور ھوئے۔لیکن قریش کے بعض سرداروں کے اقدام اور بعض معجزات کے رونما ھونے کی وجہ سے یہ بائیکاٹ ختم ھوگیا۔

6۔پیغمبر اکرم کو قتل کرنے کی سازش

قریش کے سرداروں نے یہ فیصلہ کیا کہ مختلف قبیلوں سے تعلق رکھنے والے قریش کے چالیس جوان رات کے اندھیرے میں پیغمبر کے گھر پر حملہ آور ھوں اور آپ کو آپ کے بستر ہ پر ھی ٹکڑے ٹکڑے کرڈالیں۔لیکن خداوند کریم (جو ھر وقت آپ کا حافظ ونگھبان تھا) نے پیغمبر کو دشمنوں کی اس سازش سے آگاہ کردیا اور پیغمبر خدا نے خدا کے حکم سے حضرت علی (ع) کو اپنے بستر ہ پر سلا کر خود مکہ سے مدینہ کی طرف ھجرت کی۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ کی طرف ھجرت اور اوس وخزرج جیسے قبیلوں کا اسلام کی طرف مائل ھونا اس کا باعث ھوا کہ مسلمانوں کو ایک امن کی جگہ مل گئی اور پراکندہ مسلمان ایک پر امن جگہ پر جمع ھوکر دین کا

دفاع کرنے کے لائق ھوگئے۔

7۔خونین جنگیں

مسلمانوں کے مدینہ منورہ میں اکٹھا ھونے اورحکومت اسلامی کی تشکیل کودیکھتے ھوئے جزیرہ نمائے عرب کے بت پرست خوفزدہ ھوگئے اوراس دفعہ یہ فیصلہ کیا کہ ھدایت کی شمع فروزاں کو جنگ اورقتل و غارت کے ذریعہ ھمیشہ کے لئے بجھادیں ۔ اسی غرض سے کفار نے مسلمانوں سے بدر، احد، خندق اورحنین کی خونین جنگیں لڑیں۔لیکن خدا کے فضل وکرم سے یہ جنگیں مسلمانوں کی فوجی طاقت میں اضافہ کا باعث بنیں اورانھوں نے بت پرستوں کوعرب میں ذلیل وخوار کرکے رکھدیا۔

8۔پیغمبر اسلام کی وفات

دشمنوں نے اپنے ناپاک عزائم کے سلسلے میں آخری امید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے باندھی تھی۔ وہ سوچ رھے تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ساتھ ھی اس تحریک کی بنیادیں اکھڑ جائیں گی اوراسلام کا بلند پایہ محل زمین بوس ھوجائے گا۔

اس مشکل کودور کرنے اوراس سازش کوناکام بنانے کے لئے دوراستے موجود تھے:

1۔امت اسلامیہ کی فکری وعقلی نشوونمااس حد تک پھنچ جائے کہ مسلمان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کی اس نئی تحریک کی عھد رسالت کے مانند ھدایت ورھبری کرسکیں اوراسے ھرقسم کے انحراف سے بچاتے ھوئے"صراط مستقیم" پرآگے بڑھائیں۔
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت کی ھمہ جھت قیادت کی سخت ضرورت تھی کیونکہ ابھی جو بدقسمتی سے امت کے افراد میں سازگار حالات نھیں پائے جاتے تھے۔اس وقت یہ مناسب نھیں ھے کہ ان حالات کے ھونے یانہ ھونے پر مفصل بحث کریں ،لیکن مختصرطور درج ذیل چند اھم نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ھے:
الف) ایک ملت کی مختلف میدانوں میں ترقی اور بنیادی انقلاب کا پیدا ھونا چند روز یا چند سالوں میں ممکن نھیں ھوتا اور مختصر مدت میں ایسے مقاصد تک نھیں پھنچا جاسکتا ھے بلکہ انقلاب کی بنیادوں کواستحکام بخشنے اوراسے لوگوں کے دلوں کی گھرائیوں میں اتارنے کیلئے ایسے ممتاز اورغیر معمولی فرد یاافراد کی ضرورت ھوتی ھے جواس تحریک کے بانی کی رحلت کے بعد امور کی باگ ڈورسنبھال سکیں اور انتھائی ھوشیاری اورپیھم تبلیغ کے ذریعہ سماج کوھرقسم کے غلط رجحانات سے بچاسکیں تاکہ پرانی نسل کی جگہ ایک ایسی نئی نسل لے لے جوابتداء سے ھی اسلامی آداب واخلاق کے ماحول میں پلی ھو۔ورنہ دوسری صورت میں تحریک کے بانی کی وفات کےساتھ ھی بھت سے لوگ اپنی پرانی روش کی طرف پلٹ جائیں گے۔
اس کے علاوہ تمام الٰھی تحریکوں میں اسلام ایسی خصوصیت کا حامل تھا جس میں اس تحریک کے استحکام کے لئے ممتاز افراد کی اشد ضرورت تھی۔دین اسلام ایسے لوگوں کے درمیان وجود میں آیا تھا جو دنیا کی پسماندہ ترین قوم شمار ھوتے تھے اوراس معاشرہ کے لوگ سماجی واخلاقی

قواعد وضوابط کے لحاظ سے انتھائی محرومیت کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے مذھبی آداب ورسوم کے طور پر وہ اپنے آباء واجداد سے وراثت میں ملی ھوئی (جو خرافات اور برائیوں سے بھری تھیں) کے علاوہ کوئی اور چیز نھیں جانتے تھے ۔ حضرت موسی (ع)اور حضرت عیسی (ع) کے دین نے ان کی سرزمین پر کوئی اثر نھیں ڈالا تھا اور حجاز کے اکثر لوگ اس سے محروم تھے اور اس کے مقابلہ میں جاھلیت کے عقائد اور رسم ورواج ان کے دلوں میں راسخ ھو کر ان کی روح میں آمیختہ ھوچکے تھے ۔

ممکن ھے کہ ایسے معاشروں میں مذھبی اصلاح زیادہ مشکل نہ ھو لیکن اس کا تحفظ اور اس کی بقا، ایسے لوگوں میں جن کی روح میں منفی عوامل نفوذ کر چکے ھوں، انتھائی مشکل کام ھوتا ھے اس کے لئے مسلسل ھوشیاری اور تدبیر کی ضرورت ھوتی ھے تا کہ ھر قسم کے انحرافات اور رجعت پسندی کو روکا جاسکے ۔

"احد" اور "حنین" کے دل دوز حوادث کے مناظر، جب گرما گرم جنگ کے دوران تحریک کے حامی رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میدان کارزار میں تنھا چھوڑ کر باگ کھڑے ھوئے تھے اس بات کے واضح گواہ ھیں کہ تحریک کے مؤمن افراد، جو اس کی راہ میں جان ومال کی قربانی دینے پر حاضر تھے، بھت کم تھے اور معاشرے کے زیادہ تر لوگ فکری وعقلی رشد و بلوغ کے لحاظ سے اس مقام پر نھیں پھنچے تھے کہ پیغمبر اسلام نظام کی باگ ڈور ان کے ھاتہ میں دیدیتے اور دشمن کی آخری امید یعنی پیغمبر کی رحلت کے انتظار، کو ناکام بنادیتے ۔

یہ وھی امت ھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اختلاف وتفرقہ کا مرکز

بن گئی اور رفتہ رفتہ 72 فرقوں میں بٹ گئی۔

جو باتیں ھم نے اوپر بیان کیں اس سے یہ واضح ھوجاتا ھے کہ پیغمبر کی رحلت کے وقت فکری اور عقلی رشد کے لحاظ سے امت اسلامیہ اس حد تک نھیں پھنچی تھی کہ دشمنوں کے منصوبے ناکام ھوجاتے اسلئے کسی دوسری چارہ جوئی کی ضرورت تھی کہ ھم ذیل میں اس کی طرف اشارہ کرتے ھیں:

2۔تحریک کو استحکام بخشنے کے لئے آسان اور سادہ طریقہ یہ ھے کہ تحریک کے اصول وفروع پر ایمان واعتقاد کے لحاظ سے پیغمبر جیسا ایک لائق وشائستہ شخص تحریک کی قیادت ورھبری کے لئے خدائے تعالیٰ کی طرف سے انتخاب کیا جائے اور وہ قوی ایمان، وسیع علم اور عصمت کے سائے میں انقلاب کی قیادت کو سنبھال کر اس کو استحکام اور تحفظ بخشے۔

یہ وھی مطلب ھے جس کے صحیح اور مستحکم ھونے کا دعویٰ شیعہ مکتب فکر کرتا ھے۔اس سلسلے میں بھت سے تاریخی شواھد بھی موجود ھیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی کے دوران 18 ذی الحجۃ کو خدا کے حکم سے اس گتھی کو سلجھادیا اور خدا کی طرف سے اپنا جانشین اور ولی مقرر فرماکر اپنی رحلت کے بعد اسلام کو استحکام اور تحفظ بخشا۔اس کا واقعہ یوں ھے، کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 10 ھ ء میں حج بجالانے کے لئے مکہ کی طرف عزیمت فرمائی، چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حج کا یہ سفر آپ کی زندگی کا آخری سفر تھا اس لئے یہ حجۃ الوداع کے نام سے مشھور رھا۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شوق سے یا احکام حج کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھنے کے لئے جن لوگوں

نے اس سفر میں آپ کا ساتھ دیا ان کی تعداد کے بارے میں مؤرخین نے ایک لاکھ بیس ہزار کا تخمینہ لگایا ہے۔

حج کی تقریبات ختم ہوئیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راہی مدینہ ہوئے جوق در جوق لوگ آپ کو الوداع کررہے تھے لیکن مکہ میں آپ سے ملحق ہونے والوں کے علاوہ سب آپ کے ہمسفر تھے۔ کاروان، جحفہ سے تین کلومیٹر کی دوری پر" غدیر خم" کے ایک صحرا میں پہنچا، اچانک وحی الٰہی نازل ہوئی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رکنے کا حکم ملا۔ پیغمبر نے بھی حکم دیا کہ سب حجاج رک جائیں تا کہ پیچھے رہنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں۔

پیغمبر کی طرف سے ایک تپتے ریگستان میں دوپہر کو تمازتِ آفتاب میں رکنے کے حکم پر لوگ تعجب میں تھے۔ اور سرگوشیاں کررہے تھے کہ ضرور خدا کی طرف سے کوئی خاص حکم پہنچا ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خدا کی طرف سے پیغمبر کو امر ہوا ہے کہ وہ ان نامساعد حالات میں لوگوں کو روک کر فرمان الٰہی پہنچائیں۔

پیغمبر اکرم کو یہ فرمان الٰہی درج ذیل آیہ شریفہ کے ذریعہ ملا۔

(یَا اَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَ إِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ) (137)

"اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچادیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا آپ خدا کی رسالت کو نہیں بجالائے اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا"

<u>اس آیہ شریفہ کے مضمون پر غور کرنے سے ہمیں مندرجہ ذیل نکات کی طرف ہدایت ملتی ہے</u>

:

اولاً: جس حکم الٰهی کو پهنچانے کی ذمه داری پیغمبر اسلام کو ملی تهی وه اتنا اهم اور عظیم تها که اگر پیغمبر اکرم (بفرض محال) اسے پهنچانے سے ڈرتے اور نه پهنچاتے تو گویا آپ نے اپنی رسالت کا کام هی انجام نهیں دیا هوتا، بلکه۔ (آینده اس کی وضاحت کریں گے که) اس مأموریت کو بجالانے سے هی آپ (ع) کی رسالت مکمل هوتی هے۔

دوسرے الفاظ میں

(مَا اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ)

(جو آپ پر نازل کیا گیا هے) کا مقصود قرآن مجید کی تمام آیات اور احکام اسلامی نهیں هو سکتے هیں، کیونکه یه بات بالکل واضح هے که اگر پیغمبر اکرم صلی الله علیه وآله وسلم احکام الٰهی نه پهنچاتے تو اپنی رسالت کو انجام هی نه دیا هوتا اور اس قسم کے بدیهی امر کے بارے میں کچھ کهنے اور آیت نازل کرنے کی ضرورت هی نهیں تهی، بلکه اس کا مقصد ایک خاص موضوع کو پهنچانا هے که اس کا پهنچانا رسالت پهنچانے کے برابر شمار هوتا هے اور جب تک اسے نه پهنچایا جائے، رسالت کی عظیم ذمه داری اپنے کمال تک نهیں پهنچتی۔

اس بنا پر اس مأموریت کا مسئله اسلام کے اهم اصولوں میں سے ایک هونا چاهئے جو اسلام کے دوسرے اصول و فروع سے پیوسته هو اور خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اکرم صلی الله علیه وآله وسلم کی رسالت کی طرح یه بهی ایک اهم مسئله هو۔

ثانیاً: سماجی حالات اور ان کے محاسبات کے پیش نظر پیغمبر اکرم صلی الله علیه وآله وسلم یه گمان

کرتے تھے کہ اس مأموریت کو انجام دینے کی صورت میں ممکن ھے لوگوں کی طرف سے آپ کو کوئی نقصان پھنچے، اس لئے خدائے تعالیٰ نے آپ کے ارادہ کو قوت بخشنے کے لئے فرمایا:

(واللهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ)

"خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا"

اب یہ دیکھنا ھے کہ مفسرین اسلام نے اس آیت کے موضوع کے بارے میں جو احتمالات (138) بیان کئے ھیں ان میں سے کون سا احتمال اس آیہ شریفہ کے مضمون سے قریب تر ھے۔شیعہ محدثین کے علاوہ اھل سنت محدثین کے تیس 1# افراد نے لکھا ھے کہ یہ آیہ شریفہ غدیر کے دن نازل ھوئی ھے، جس دن خدا نے پیغمبر کو مامور کیا کہ علی (ع) کو" مؤمنین کے مولا" کے طور پر پھچنوائیں۔

امت پر پیغمبر کی جانشینی کے عنوان سے امام (ع) کی قیادت کا مسئلہ ھی اتنا ھی اھم اور سنجیدہ تھا کہ اس کا پھنچانا رسالت کی تکمیل کا باعث اور نہ پھنچانا رسالت کے نقصان اور رسول کی زحمتوں کے تباہ ھوجانے کا سبب شمار ھوتا۔

اسی طرح پیغمبر اکرم کا اجتماعی محاسبات کے پیش نظر خوف وتشویش سے دوچار ھونا بجا تھا، کیونکہ حضرت علی (ع) جیسے صرف 33 سالہ شخص کا جانشین اور وصی قرار پانا اس گروہ کے لئے انتھائی سخت اور دشوار تھا جو عمر کے لحاظ سے آپ (ع) سے کھیں زیادہ بڑے تھے (139) اس کے علاوہ ایسے افراد بھی مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے جن کے اسلاف مختلف جنگوں

میں حضرت علی (ع) کے ھاتھوں قتل ھو چکے تھے اور قدرتی طور وہ کینہ توز ایسے شخص کی حکومت کی شدید مخالف کرتے۔

اس کے علاوہ حضرت علی (ع) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد بھی تھے، اور تنگ نظر لوگوں کی نظر میں ایسے شخص کو خلافت کے عھدہ پر مقرر کرنا اس کا سبب ھوتا کہ وہ اس عمل کو کنبہ پروری تصور کرتے۔

لیکن ان تمام ناسازگار حالات کے باوجود خدائے تعالی کا حکیمانہ ارادہ یھی تھا کہ رسول کا جانشین مقرر فرما کر اسلامی تحریک کو تحفظ بخشے اور اپنے نبی کی عالمی رسالت کا رھبر و راھنما مقرر کرکے اسے تکمیل تک پھنچائے۔

اب اس تاریخی واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

انیسویں فصل

حدیث غدیر (دوسرا حصہ)

غدیر کا تاریخی واقعہ ایک ابدی حقیقت

18 ذی الحجۃ کی دوپھر کا وقت تھا، سورج کی تمازت نے غدیر خم کی سرزمین کو جھلسا رکھا تھا۔

لوگوں کی ایک بڑی تعداد جس کے بارے میں 70 ھزار سے 120 ھزار تک لکھا گیا پیغمبر کے حکم سے وھاں پر پڑاؤ ڈالے ھوئے تھی اور یہ لوگ اس دن رونما ھونے والے تاریخی واقعہ کا انتظار کررھے تھے۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ، لوگوں نے اپنی ردائیں تہ کر کے آدھی سر پر اور آدھی پاؤں کے نیچے رکھی تھیں۔

ان حساس لمحات میں اذان ظھر کی آواز سے تمام صحرا گونج اٹھا، اور لوگ نماز ظھر کے لئے آمادہ ھوئے، پیغمبر اکرم نے اس عظیم اور پر شکوہ اجتماع کہ سرزمین غدیر پہ ایسا عظیم نھیں ھوا تھا کے ساتھ نماز ظھر ادا کی۔ اس کے بعد آپ لوگوں کے درمیان تشریف لائے اور اونٹوں کے پالان سے بنے ایک بلند منبر پر جلوہ افروز ھوکر بلند آواز سے خطبہ دینا شروع کیا اور فرمایا:

”حمد و ستائش تنھا خدا کے لئے ھے، ھم اسی سے مدد چاھتے ھیں اور اسی پر ایمان رکھتے ھیں، اور اسی پر توکل کرتے ھیں، اور اپنے نفس امارہ اور برائی کے شر سے محفوظ رھنے کے لئے اس خدا کی پناہ لیتے ھیں، جس کے سوا گمراھوں کی ھدایت و راھنمائی کرنے والا کوئی نھیں ھے۔ ھم گواھی دیتے ھیں کہ جس کی خداوند کریم ھدایت کرے کوئی اسے گمراہ نھیں کرسکتا ھم اس خدا کی گواھی دیتے ھیں جس کے علاوہ کوئی خدا نھیں ھے اور محمد خدا کا بندہ اور اس کا رسول ھے۔

اے لوگو! خدائے لطیف و خبیر نے مجھے خبر دی ھے کہ ھر پیغمبر کی رسالت کی مدت اس سے پھلے کی رسالت کی آدھی ھوتی ھے، اور میں جلدی ھی دعوت حق کو لبیک کھنے والا اور تم سے رخصت ھونے والا ھوں، میں ذمہ دار ھوں اور تم لوگ بھی ذمہ دار ھو، میرے بارے میں کیا سوچتے

ہو؟

اصحاب رسول نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے دین خدا کی تبلیغ کی، ہمارے بارے میں خیر خواہی کی اور ہماری نصیحت فرمائی اور اس راہ میں سعی و کوشش کی، خدائے تعالی آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔

مجمع پر خاموشی چھا گئی تو پیغمبر نے فرمایا: کیا تم لوگ گواہی نہیں دیتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور محمد خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے، جنت، جہنم اور موت حق ہے۔ بے شک قیامت آئے گی اور خدائے تعالیٰ زمین میں دفن لوگوں کو پھر سے زندہ کرے گا؟

اصحاب رسول: جی ہاں! جی ہاں! ہم گواہی دیتے ہیں۔

پیغمبر: میں تم لوگوں کے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں تم لوگ ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرو گے؟

ایک شخص: یہ دو گراں قدر چیزیں کیا ہیں؟

پیغمبر: ثقل اکبر خدا کی کتاب ہے کہ اس کا ایک سرا خدا سے وابستہ اور دوسرا سرا تمھارے ہاتھ میں ہے، خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رہو تا کہ گمراہ نہ ہو اور "ثقل اصغر" میری عترت اور اہل بیت (ع) ہیں۔ خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ میری یہ دو یادگاریں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔

خبردار، اے لوگو: خدا کی کتاب اور میری عترت سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ان سے پیچھے رہنا تا کہ نابودی سے بچے رہو۔

اس موقع پر پیغمبر نے علی (ع) کا ھاتہ پکڑ کر انھیں اس قدر بلند کیا کہ آپ کے بغل کے نیچے کی سفیدی نمایاں ھوگئی اور تمام لوگوں نے علی (ع) کو پیغمبر کے پھلو میں دیکھا اور انھیں اچھی طرح سے پھچان لیا۔ سب سمجھ گئے کہ اس اجتماع کا مقصد، علی (ع) سے مربوط کوئی اعلان ھے۔ سب شوق و بے تابی کے ساتھ پیغمبر کی بات سننے کے منتظر تھے۔

پیغمبر: اے لوگو! مؤمنوں پر، خود ان سے زیادہ سزاوار کون ھے؟

اصحاب پیغمبر: خدا اور اس کا پیغمبر بھتر جانتے ھیں۔

پیغمبر: "خدا میرا مولا اور میں مؤمنوں کا مولا اور ان پر، خود ان سے زیادہ اولی و سزاوار ھوں۔ اے لوگو!

"من کنت مولاہ فعلی مولاہ"

یعنی جس جس کا میں مولا --- خود اس سے زیادہ اس پر سزاوار ھوں اس کے علی (ع) بھی مولا ھیں" اور پیغمبر نے اس جملہ کو تین بار فرمایا (140)

اس کے بعد فرمایا: پروردگارا! اس کو دوست رکہ، جو علی (ع) کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکہ جو علی (ع) سے دشمنی کرے۔ خدایا! علی (ع) کے دوستوں کی مدد فرما اور اس کے دشمنوں کو ذلیل وخوار فرما۔ خداوندا! علی کو مرکز حق قرار دے"

اس کے بعد پیغمبر نے فرمایا: ضروری ھے کہ اس جلسہ میں حاضر لوگ اس خبر کو غیر حاضروں تک پھنچا دیں اور دوسروں کو بھی اس واقعہ سے باخبر کریں۔

ابھی غدیر کا اجتماع برقرار تھا کہ فرشتہ وحی تشریف لایا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

بشارت دی کہ خداوند کریم فرماتا ھے: میں نے آج اپنے دین کومکمل کردیااوراپنی نعمتیں تم پر تمام کردیں اوراس پرراضی ھوا کہ یہ کامل شدہ اسلام تمھارا دین ھو(141)

یھاں پرپیغمبراسلام نے تکبیر کی آواز بلند کرتے ھوئے فرمایا: میں خدا کا شکرگزارھوں کہ اس نے اپنے دین کومکمل کردیا اور اپنی نعمت تمام کردی اور میری رسالت اور میرے بعد علی(ع) کی ولایت پرخوشنودھوا۔

اس کے بعد پیغمبراپنی جگہ سے نیچے تشریف لائے،آپ کے اصحاب گروہ گروہ آگے بڑھے اورعلی(ع) کومبارکبا ددی اورانھیں اپنے اورتمام مومنین ومومنات کا مولا کھا۔

اس موقع پررسول خدا کا شاعر" حسان بن ثابت" اٹھااوراس نے اس تاریخی روداد کوشعر کی صورت میں بیان کرکے اسے ابدی رنگ دیدیا۔اس کے اس قصیدہ سے صرف دوابیات کا ترجمہ یھاں پرذکرکرتے ھیں:

" پیغمبرنے علی(ع) سے فرمایا: کھڑے ھوجاؤ! میں نے تمھیں اپنے بعدلوگوں کی قیادت اور راھنمائی کے لئے منتخب کیا ھے۔(142) جس کا میں مولاھوں،اس کے علی(ع) بھی مولا ھیں۔

لوگو!تم لوگوں پرلازم ھے کہ علی(ع) کے سچے اورحقیقی دوست رھو۔

اوپر بیان شدہ روداد غدیر کے واقعہ کا خلاصہ ھے جواھل سنت علماء کے اسناد وماخذ میں ذکر ھوا ھے۔شیعوں کی کتابوں میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان ھوا ھے۔

مرحوم طبرسی نے اپنی کتاب" احتجاج" میں پیغمبرخدا سے ایک مفصل خطبہ نقل کیا ھے،شائقین

اس کتاب میں اس خطبہ کا مطالعہ کر سکتے ھیں(143)

غدیر کا واقعہ لافانی وجاویدانی ھے

خدائے تعالیٰ کا حکیمانہ ارادہ یھی تھا کہ غدیر کا تاریخی واقعہ تمام زمانوں اورصدیوں میں ایک زندہ تاریخ کی صورت میں باقی رھے تاکہ ھر زمانے کے لوگ اس کی طرف جذب ھوں اور ھر زمانے میں اسلام کے اھل قلم تفسیر،حدیث،کلام اور تاریخ پر قلم اٹھاتے وقت اس موضوع پر لکھیں اور مذھبی مقررین ، وعظ وسخن کی مجلسوں میں اسے بیان کرتے ھوئے اس کو امام (ع) کے ناقابل انکار فضائل میں شمار کریں ۔ادباء وشعراء بھی اس واقعہ سے الھام حاصل کر کے اپنے ادبی ذوق وشوق کو اس واقعہ سے مزین کر کے مولا کے تئیں اپنے جذبات مختلف زبانوں میں بھترین ادبی نمونوں کی صورت میں پیش کریں۔

یہ بات بلاسبب نھیں کہ انسانی تاریخ میں بھت کم ایسے واقعات گزرے ھیں جو واقعہ غدیر کی طرح علماء،محدثین،مفسرین،متکلمین،فلاسفہ،مقررین،شعراء،مؤرخین وسیرت نگاروں کی توجہ کا مرکز بنے ھیں ان سب نے اس واقعہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور عقیدت کے پھول نچھاور کئے ھیں۔

بیشک اس واقعہ کے لافانی اور جاویدانی ھونے کا ایک سبب یہ بھی ھے کہ اس واقعہ سے مربوط قرآن مجید میں دو آیتیں(144) نازل ھوئی ھیں۔چونکہ قرآن لافانی اور ابدی ھے اس لئے یہ واقعہ بھی لافانی ھو گیا ھے اور ھرگز ختم ھونے والا نھیں ھے۔

اس کے علاوہ چونکہ گزشتہ زمانہ میں اسلامی معاشرہ اورآج کا شیعہ معاشرہ اس روزکو مذھبی عیدوں میں ایک عظیم عید شمار کرتا ھے اوراس مناسبت سے ھرسال باشکوہ تقریبات منعقد کرتا ھے لھذا قدرتی طور پر غدیر کے تاریخی واقعہ نے ابدیت کا رنگ اختیار کرلیا ھے اور کبھی فراموش ھونے والانھیں ھے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے صاف ظاھرھوتا ھے کہ 18 ذی الحجۃ الحرام کا دن مسلمانوں کے درمیان عید غدیر کے طور پر معروف تھا، یھاں تک کہ "ابن خلکان" فاطمی خلیفہ مستعلی بن المستنصر کے بارے میں لکھتا ھے:

"سن 487ء ہ عید غدیر کے دن، کہ 18 ذی الحجۃ الحرام ھے،لوگوں نے اس کی بیعت کی (145)المستنصر باللہ کے بارے میں"العبیدی" لکھتا ھے:

"وہ سن 487ھء میں جب ماہ ذی الحجۃ میں 12 شبیں باقی بچی تھیں،فوت ھوا، یہ شب وھی 8 اویں ذی الحجۃ کی شب ھے،اورشب عید غدیر ھے"(146)

ابن خلکان نے ھی اس شب کوعید غدیر کی شب کا نام نھیں دیا ھے بلکہ "مسعودی"(147)# اور"ثعالبی"(148)نے بھی اس شب کوامت اسلامیہ کی مشھور ومعروف شبوں میں شمار کیا ھے۔

عید غدیر کے دن جشن وسرور کی تقریبات کا سلسلہ اس دن خود پیغمبر کے عمل سے شروع ھوا ھے۔ کیونکہ اس دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مھاجرین وانصار بلکہ اپنی بیویوں کو بھی حکم دیا تھا کہ علی (ع) کے پاس جاکرانھیں اس عظیم فضیلت کی مبارکباد دیں۔

زید بن ارقم کھتے ھیں: مھا جرین میں سے سب سے پھلے جن افراد نے علی (ع) کے ھاتہ پر بیعت کی، ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ اور زبیر تھے اور مبارکباد کی یہ تقریب اس دن سورج ڈوبنے تک جاری رھی۔

واقعہ کی لافانیت کے دیگر دلائل

اس تاریخی واقعہ کی اھمیت کے لئے اتنا ھی کافی ھے کہ 110 صحابیوں نے اسے نقل کیا ھے ۔لیکن اس کا مطلب یہ نھیں ھے کہ اتنی بڑی جمعیت میں سے صرف ان ھی افراد نے غدیر کے واقعہ کو نقل کیا ھے، بلکہ سنی علماء کی کتابوں میں اس واقعہ کے صرف 110 راوی ذکر ھوئے ھیں۔ یہ بات صحیح ھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہعلیہ وآلہ وسلم نے ایک لاکہ کے مجمع میں تقریر فرمائی، لیکن ان میں بھت سے لوگ حجاز سے دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے تھے، جن سے کوئی حدیث نقل نھیں ھوئی ھے، یا اگر نقل ھوئی بھی ھو تو ھم تک نھیں پھنچي ھے۔ ان میں سے اگر کسی جماعت نے اس واقعہ کو نقل بھی کیا ھے تو تاریخ ان کے نام درج کرنے میں کامیاب نھیں ھوئی۔

دوسری صدی ھجری میں -- جو عصر تابعین کے نام سے مشھور ھے نواسی افراد نے اس حدیث کو نقل کیا ھے۔

بعد والی صدیوں میں حدیث کے بھت سے راوی سنی علماء تھے ان میں سے تین سو ساٹہ راویوں نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ھے اور ان میں سے بھت سے لوگوں نے

اس حدیث کے صحیح اور محکم ہونے کا اعتراف بھی کیا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں 92 (بانبے) سنی علماء نے ، چوتھی صدی میں تینتالیس (43) ، پانچویں صدی میں جوبیس (24) ، چھٹی صدی میں بیس (20)، ساتویں صدی میں اکیس (21) ، آٹھویں صدی میں اٹھارہ (18) ،نویں صدی میں سولہ (16) ، دسویں صدی میں (14) چودہ ، گیارھوں صدی میں بارہ (12) ، بارھویں صدی میں تیرہ (13) ، تیرھویں صدی میں بارہ (12) اور چودھویں صدی میں بیس (20) سنی علماء نے اس حدیث کونقل کیا ہے۔

مذکورہ علماء کی ایک جماعت نے اس حدیث کی نقل پرهی اکتفاء نھیں کی ھے بلکہ اس کے اسناد اور مفھوم پر مخصوص کتابیں لکھی ھےں۔

عالم اسلام کے عظیم اور نامور تاریخ دان ،طبری نے "الولایۃ فی طرق حدیث الغدیر" کے موضوع پر کتاب لکھی ھے اور اس میں اس حدیث کو ستر (70) سے زیادہ طریقوں سے ، پیغمبر اکرم صلی اللہعلیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ھے۔

ابن عقدہ کوفی نے اپنے رسالہ "ولایت" میں اس حدیث کو ایک سو پچاس (149) افراد سے نقل کیا ھے۔

جن افراد نے اس تاریخی واقعہ کی خصوصیات کے بارے میں مخصوص کتابیں لکھی ھیں، ان کی تعداد چھبیس (26) ھے ۔ممکن ھے اس سے زیادہ افراد ھوں جنھوں نے اس موضوع پر کتابیں یا مقالات لکھے ھیں لیکن تاریخ میں ان کا نام درج نھیں ھوا ھے یا ھماری رسائی ان

تک نهیں هے۔

شیعه علماء نے بهی اس تاریخی واقعه پر گراں بها کتابیں لکهی هیں که ان تمام کتابوں میں جامع ترین اور تاریخی کتاب علامه مجاهد مرحوم آیت اللہ امینی کی کتاب "الغدیر" هے۔

هم نے امام (ع) کی زندگی کے اس پهلو کے بارے میں ان کی اس کتاب سے کافی استفاده کیا هے۔

بیسویں فصل

حدیث غدیر (تیسرا حصه)

غدیر کے باشکوه اجتماع کا مقصد؟

گزشته بحثوں سے اچهی طرح واضح اور ثابت هوگیا که غدیر کا واقعه قطعی اور یقینی طور پر ایک تاریخی واقعه هے اور اس میں کسی قسم کا شک وشبهه کرنا بدیهی امور میں شک کرنے کے

مترادف ھے۔ اسلامی احادیث میں شاید ھی کوئی ایسی حدیث ھو جو متواتر اور قطعی ھونے کے لحاظ سے اس حدیث کی برابری کر سکے۔

اس لئے ھم اس کی سند کے بارے میں مزید بحث وگفتگو نھیں کریں گے بلکہ اب اس کے مفاد ومفھوم کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس حدیث کو سمجھنے کی کنجی یہ ھے کہ جملہ" من کنت مولاہ فعلی مولاہ××" میں وارد شدہ لفظ "مولیٰ" کو سمجھ لیں اس لفظ کے معنی کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر حدیث کا مفھوم بھی واضح ھو جائے گا۔

سب سے پھلے یہ امر قابل غور ھے کہ قرآن مجید میں لفظ "مولیٰ"، اولی" اور" ولی" کے معنی میں استعمال ھوا ھے، جیسے:

1۔(فَالْيَوْمَ لاَ يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَ لاَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَأْوَاكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلَاكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ)

تو آج (قیامت کے دن) نہ تم سے کوئی فدیہ یا عوض لیا جائے گا اور نہ کفار سے، تم سب کا ٹھکانا جھنم ھے وھی تم سب کا صاحب اختیار (مولا) ھے اور تمھارا بدترین انجام ھے۔ (150)

اسلام کے بڑے اور نامور مفسرین اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں کھتے ھیں: اس آیت میں "مولیٰ" کا لفظ" اولی" کے معنی میں ھے، کیونکہ یہ افراد، جو ناشائستہ اور برے اعمال کے مرتکب ھوئے ھیں تو ان کے لئے ان اعمال کے عوض جھنم کی آگ کے سوا کوئی اور چیز سزاوار نھیں ھے(150)

2۔(يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ لَبِئْسَ الْمَوْلَى وَلَبِئْسَ الْعَشِيرُ)

"یہ اس بت کو پکارتا ھے جس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ قریب تر ھے وہ اس کا بدترین سرپرست (ولی) اور بدترین ساتھی ھے"۔(151)

یہ آیہ شریفہ اپنے مضمون اور گزشتہ آیات کے قرینہ کی روشنی میں مشرکوں اور بت پرستوں کے عمل سے متعلق ھے کہ وہ بتوں کو اپنا صاحب اختیار (ولی) جانتے تھے اور اسے اپنے سرپرست (ولی) کی حیثیت سے مانتے تھے اور "ولی" کی حیثیت سے ھی ان کو پکارتے تھے۔

ان دو آیتوں اور اسی طرح دوسری آیات جن کے ذکر سے ھم صرف نظر کرتے ھیں سے اجمالی طور سے ثابت ھوتا ھے کہ "مولیٰ" کے معنی وھی "اولیٰ" اور "ولی" کے ھیں۔

اب دیکھنا یہ ھے کہ جملہ "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ ※※ کا مقصد کیا ھے؟ کیا اس کا مقصد وھی نفوس پر تصرف رکھنے میں اولیٰ ھونا ھے جس کا لازمہ کسی شخص کا انسان پر ولایت مطلقہ رکھنا ھے یا حدیث کا مفھوم کچھ اور ھے جیسا کہ بعض لوگوں نے تصور کیا ھے کہ حدیث غدیر میں "مولیٰ" دوست اور ناصر کے معنی میں ھے۔

بے شمار قرائن اس کے گواہ ھیں کہ "مولیٰ" سے مراد وھی پھلا معنی ھے جسے علماء اور دانشوروں نے ولایت مطلقہ سے تعبیر کیا ھے اور قرآن مجید نے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا ھے:

(اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِینَ مَنْ اَنْفُسِهِمْ)(152)

بیشک نبی تمام مومنین سے ان کے نفوس کی نسبت زیادہ اولیٰ ھے۔

اگر کوئی شخص (تسلط اور تصرف کے لحاظ سے) کسی کی جان پر خوداس سے زیادہ شائستہ و سزاوار هوتو وہ قدرتی طور پراس کے مال پر بھی یھی اختیار رکھتا هوگا۔اور جو شخص کسی انسان کی جان و مال پر اولی بالتصرف هو، وہ اس کے بارے میں ولایت مطلقہ رکھتا هے۔

اس بنا پر انسان کو اس (ولی) اس کے تمام احکام کی مو بمو اطاعت کرنی چاهئے اور جس چیز سے وہ منع کرے اس سے باز رهنا چاهئے۔

یہ عهدہ اور منصب، خدا کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا تھا۔آپ خود ذاتی طور پر هرگز اس منصب و مقام کے حامل نهیں تھے۔

واضح تر الفاظ میں یوں کها جائے گا کہ یہ خدائے تعالیٰ هے جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی جان و مال پر مسلط فرمایا هے۔آپ کو هر قسم کے امر و نهی کے اختیارات دئے هیں اور آپ کے احکام واوامر کی مخالفت کو خدا کے احکام کی مخالفت جانا هے۔

چونکہ قطعی اور یقینی دلائل سے یہ ثابت هو چکا هے کہ اس حدیث میں "مولیٰ" کے معنی وهی هیں جو آیہ شریفہ میں " اولیٰ" کے هیں ، لهذا قدرتی طور پر امیر المؤمنین حضرت علی (ع) اسی منصب و مقام کے حامل هوئے جس کے آیہ شریفہ کی نص کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے،یعنی اپنے

زمانے میں امت کے پیشوا اور معاشرے کے رهبر اور لوگوں کی جان و مال پر اولی و بالتصرف کا اختیار رکھنے والے اور امامت کا یهی وہ عظیم اور بلند مرتبہ هے جسے ولایت الهیہ سے تعبیر کیا جاتا هے (یعنی وہ ولایت جو خدا کی طرف سے بعض خاص افراد کو وسیع پیمانے پر عطا هوتی

ھے)

اب ھم وہ قرائن وشواھد بیان کرتے ھیں جن سے پوری طرح ثابت ھوتا ھے کہ اس حدیث میں لفظ "مولیٰ" کے معنی تمام امور میں (اولی بالتصرف) اور صاحب اختیار ھونے کے علاوہ کچھ اور نھیں ھے۔

ذیل میں ایسے چند شواھد ملاحظہ ھوں:

1۔غدیر کے تاریخی واقعہ کے دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاعر حسّان بن ثابت حضور اکرم سے اجازت حاصل کر کے کھڑے ھوئے اور پیغمبر اکرم کے بیانات کے مضمون کو اشعار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔یھاں قابل توجہ نکتہ یہ ھے کہ اس فصیح ،بلیغ ،اور عربی زبان کے رموز سے واقف شخص نے لفظ "مولیٰ" کی جگہ پر امام وھادی کا لفظ استعمال کیا ھے، ملاحظہ ھو:

فقال لہ قم یا علی فاننی
رضیتك من بعدی اماماً و ھادیا

یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی (ع) کی طرف رخ کر کے ان سے فرمایا: اٹھو کہ میں نے تمھیں اپنے بعد لوگوں کا امام وھادی مقرر کر دیا ھے"

واضح رھے کہ حسّان نے پیغمبر کے کلام میں موجود لفظ "مولیٰ" سے امت کی امامت ، پیشوائی

اور هدایت کے علاوہ کوئی اور معنی نهیں لئے هیں (153)

صرف حسّان هی لفظ" مولیٰ" سے یہ نهیں سمجھے، بلکہ اس کے بعد بھی اسلام کے عظیم شعرا جن میں سے اکثر اعلیٰ درجے کے شعرا اور بعض عربی زبان کے استاد شمار هوتے تھے نے بھی اس لفظ سے وهی معنی لئے هیں جو حسان نے سمجھے تھے، یعنی امت کی امامت وپیشوائی۔

2۔امیر المؤمنین (ع) نے معاویہ کو لکھے گئے اپنے چند اشعار میں حدیث غدیر کے بارے میں یوں فرمایا هے:

و اوجب لی ولایته علیکم

رسول الله یوم غدیر خم

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری ولایت کوتم لوگوں پر غدیر کے دن واجب فرمایا هے"

علی (ع) سے بهتر کون هوسکتا هے جو همارے لئے حدیث کے حقیقی مفهوم کو واضح کر سکے؟ جبکہ شیعہ وسنی آپ (ع) کے علم، امانتداری اور تقویٰ کے سلسلے میں اتفاق نظر رکھتے هیں۔ چنانچہ هم دیکھتے هیں کہ حضرت (ع) حدیث غدیر سے استدلال کرتے هوئے فرماتے هیں:

"پیغمبر خدا نے غدیر کے دن میری ولایت کوتم لوگوں پر واجب فرمایا"

کیا اس وضاحت سے یہ مطلب نهیں نکلتا هے کہ غدیر کے دن حاضر تمام لوگوں نے آنحضرت (ع) کے بیانات سے دینی سرپرستی اور معاشرے کی رهبری کے علاوہ کوئی اور مفهوم نهیں سمجھا

تھا؟

خود حدیث میں ایسے قرائن موجود ھیں جو اس بات کی گواھی دیتے ھیں کہ پیغمبر اسلام کے اس جملہ کا وھی مطلب ، یعنی حضرت علی (ع) کا "اولی بالتصرف" وصاحب اختیار ھونا ھے۔ کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جملہ "من کنت مولاہ" فرمانے سے پھلے یوں فرمایا تھا:

"الست اولیٰ بکم من انفسکم"

کیا میں تم لوگوں پر تمھارے نفوس سے زیادہ اختیار نھیں رکھتا ھوں؟

اس جملہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "اولی بکم من انفسکم" سے استفادہ فرمایا ھے اور اپنے آپ کو تمام لوگوں پر ان کے نفوس سے زیادہ صاحب اختیار بتایا ھے۔

اس کے فوراً بعد فرماتے ھیں:

"من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ"

ان دو جملوں کی ترتیب سے ذکر کئے جانے کا مقصد کیا ھے؟ کیا اس سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد یہ نھیں ھے کہ علی (ع) بھی میری طرح لوگوں کے نفوس پر صاحب اختیار ھیں جسے آپ نے پھلے اپنے لئے ثابت فرمایا اور یہ جو آپ نے فرمایا کہ: "اے لوگو! وھی منصب ومقام جس کا میں حامل ھوں، علی (ع) بھی اسی منصب کے حامل ھیں" اگر پیغمبر کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ھوتا تو اپنی اولویت کے بارے میں پھلے لوگوں سے اقرار لینے کی ضرورت ھی نھیں تھی۔

4۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تقریر کی ابتداء میں لوگوں سے اسلام کے تین اھم

اصول (توحید، نبوت، معاد) کے بارے میں اقرار لیتے ھوئے فرمایا:

"اَلَسْتُمْ تَشْهَدُونَ اَنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ وَ اَنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ وَ النَّارَ حَقٌّ"

یعنی، کیاتم لوگ گواھی نھیں دیتے ھو کہ خدا کے سوا کوئی پروردگار نھیں ھے، محمد اس کا بندہ اور رسول ھے اور بھشت و جھنم حق ھیں۔

یہ اقرار لینے کا مقصد کیا ھے؟ کیا اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ھے کہ پیغمبر اسلام لوگوں کے ذھنوں کو اس پر آمادہ کرنا چاھتے تھے کہ علی کے بارے میں جس منصب کا اعلان کرنے والے ھیں وہ انھی اصولوں کے مانند اھم ھے، اور لوگ جان لیں کہ آپ کی ولایت وخلافت کا اقرار اسلام کے مذکورہ تین اصول کے مانند ھے جس کا سب نے اقرار واعتراف کیا ھے؟ اگر "مولیٰ" کا مقصد دوست اور مددگار لیا جائے تو اس صورت میں جملوں کا سلسلہ ھی ٹوٹ جاتا ھے اور پیغمبر کے کلام کی بلاغت و پائداری ختم ھوجاتی ھے۔ کیونکہ منصب ولایت سے الگ ھٹ کر حضرت علی (ع) خود ایسے عظیم مسلمان تھے جنھوں نے ایسے معاشرہ میں پرورش پائی تھی جھاں پر تمام مؤمنوں سے دوستی کی ضرورت کوئی ڈھکی چھپی بات نھیں تھی چہ جائیکہ علی (ع) جیسے مؤمن سے دوستی جسے پیغمبر اس اھتمام وشأن کے ساتھ ایک بڑے اجتماع میں اعلان فرماتے! اور اس صورت میں یہ امر اتنا اھم بھی نھیں تھا کہ اسلام کے تین بنیادی اصولوں کے برابر قرار پاتا۔

5۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خطبہ کے آغاز میں اپنی رحلت کی طرف اشارہ کرتے ھوئے فرماتے ھیں:

"انه یوشك ان ادعی فاجیب"

"قریب ھے کہ میں دعوت حق کو لبیک کھوں"

یہ جملہ اس امر کی حکایت کرتا ھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رحلت کے بعد کے لئے کوئی اھتمام واقدام کرنا چاھتے تھے تا کہ اپنے بعد پیدا ھونے والے خلأ کو پر کریں۔ اور بلاشبہ واضح ھے کہ جو چیز اس خلأ کو پر کرسکتی تھی وہ صرف حضرت علی (ع) کی خلافت و امامت تھی کہ رسول خدا کی رحلت کے بعد امور کی باگ ڈور حضرت علی (ع) اپنے ھاتہ میں لے لیں، نہ کہ علی (ع) کی محبت ودوستی یاان کی نصرت ومدد!

6۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جملہ "من کنت مولاہ" کے بعد یوں فرمایا:

اللہ اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمة و رضی الرب برسالتی و الولایة لعلی بن ابی طالب

میں خدا کی طرف سے تکمیل دین، اتمام نعمت، اپنی رسالت اور علی (ع) ابن ابیطالب کی ولایت پر تکبیر کھتا ھوں۔

7۔اس سے واضح اور بھتر کیا گواھی ھوسکتی ھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر سے نیچے تشریف لانے کے بعد شیخین اور اصحاب رسول کی ایک بڑی جماعت نے حضرت علی (ع) کی خدمت میں مبارک باد پیش کی اور مبارک بادی کا یہ سلسلہ سورج ڈوبنے تک جاری رھا؟

مزے کی بات یہ ھے کہ شیخین پھلے افراد تھے جنھوں نے امام (ع) سے کھا:

"ھنیئاً لك یا علی بن ابی طالب اصبت و امسیت مولی کل مؤمن و مومنة"

"مبارک ھو آپ کو یہ منصب، اے علی (ع)! کہ آپ ھر مومن زن و مرد کے مولیٰ ھو گئے"

حقیقت میں حضرت علی (ع) اس روز امت کی سرپرستی و رھبری کے علاوہ کسی اور منصب کے مالک نھیں بنے تھے جبھی وہ اس قسم کی مبارکباد کے مستحق قرار پائے اور اسی وجہ سے اس دن ایسے کی بے مثال تقریب اور ایسے عظیم اجتماع کا اھتمام کیا گیا۔

8۔ اگر مقصد صرف علی (ع) کی دوستی کا اعلان تھا تو یہ ضروری نھیں تھا کہ پیغمبر اسلام ایسے موسم گرما میں حجاج کے ایک لاکہ کے مجمع کو رکوا کر اور لوگوں کو تپتی ریت پر بٹھا کر مفصل خطبہ بیان کرتے اور اس کے بعد اس مسئلہ کو پیش کرتے۔

کیا قرآن مجید نے مؤمن افراد کو ایک دوسرے کا بھائی نھیں پکارا ھے؟ جیسا کہ فرمایا ھے:

(اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ)(154)

"باایمان لوگ آپس میں ایک دوسر کے بھائی ھیں"

کیا قرآن مجید نے مؤمنوں کا تعارف ایک دوست کے دوسرے کی حیثیت سے نھیں کرایا ھے جیسا کہ فرماتا ھے:

(وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ)

"باایمان لوگ ایک دوسرے کے دوست ھیں" (155)

علی (ع) بھی تو اسی باایمان معاشرے کی ایک فرد تھے، اس لئے اس کی ضرورت ھی نھیں تھی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم الگ سے اور وہ بھی اس اھتمام کے ساتھ علی (ع) کی دوستی اور محبت کا اعلان فرماتے!!

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ، کہ حدیث غدیر کا مقصد علی (ع) کی دوستی یا ان کی نصرت و مدد کو ضروری قرار دینا تھا اور پیغمبر کے خطبہ میں لفظ "مولیٰ" دوست یا ناصر کے معنی میں ہے، درحقیقت تعصب پر مبنی ایک قسم کی غیر منصفانہ تفسیر اور بہت بچگانہ باتیں ہیں۔ گزشتہ قرائن اور اس خطبہ کے اول سے آخر تک بغور مطالعہ کے بعد یہ ناقابل انکار حقیقت معلوم ہوجاتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ میں "مولیٰ" کا ایک ہی معنی ہے، یعنی "صاحب اختیار" (اولی بالتصرف) ہونا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کا مقصد سیادت اور آقائی ہے اور مولیٰ "سید" کے معنی میں ہے تو اس سیادت کا مقصود وہ دینی والہی سیادت ہے جو امام کی اطاعت کو لوگوں پر واجب اور ضروری قرار دیتی ہے۔

حوالے

38۔(وجادلهم بالتی هی احسن)(نحل/125)

39۔1۔شرح نهج البلاغہ ابن ابی الحدید ج14، ص36

40 شرح نهج البلاغہ، ج1، خطبہ شقشقیہ۔

41۔ و قلت إنّی کنت اقاد کما یقاد الجمل المخشوش لا بایع، و لعمر الله لقد أردت أن تذم فمدحت، و أن تفضح فافتضحت و علی المسلم من غضاضة فی ان یکون مظلوماً ما لم یکن شاکاً فی دینه و لا مرتاباً بیقینه" (نهج البلاغه، خط 28)

42۔ "ولا یخطر ببالی انّ العرب تزعج هذا الامر من بعده صلی الله علیه وآله وسلم عن اهل بیته ولا انّهم منحوه عنی من بعده فما راعنی إلا انثیال الناس علی فلان یبایعونه.." (نهج البلاغه، خط 62)

43۔آل عمران/154۔

44۔آل عمران:144

45۔صحیح ابن ماجه، باب فتن وغیره۔

46۔الامامۃ والسیاسۃ ج1،ص5

47۔الامامۃ والسیاسۃ ج1،ص5۔

48۔انصار نے دو امیروں کی تجویز پیش کر کے اپنے پیروں پر کلھاڑی ماری۔اس مقابلہ میں ایک قدم پیچھے هٹے اور مهاجرین کے مقابلے میں اپنے ضعف و کمزوری کا اعتراف کیا۔اس لئے جب قبیلہ خزرج کے سردار نے "حباب" سے یہ بات سنی تو انتهائی افسوس کے ساتھ بول اٹھا:هذا اول الوهن، یہ تجویز همارى کمزوری کی نشانی هے

49۔آینده بحث میں اس سلسلے میں امیر المؤمنین کی تنقید بیان هوگی۔

50۔ حادثہ سقیفہ کی تفصیلات کو تاریخ طبری ج3،(حوادت سال یازدهم) اور الامامۃ و السیاسۃ ، ابن قتیبہ دینوری ج1 ، اورشرح ابن ابی الحدید ج2 ص 22۔60 سے نقل کیا گیا هے۔

51۔سیره ابن هشام، ج4،308۔ارشاد شیخ مفید،ص260

52۔(لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡءانُ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیمٍ) (زخرف/31)و

نیز رجوع کریں اسراء/90۔91)

53۔بقرہ/207۔

54۔"احتجوا بالشجرۃ واضاعوا الثمرۃ"(نھج البلاغہ خطبہ 64)

55۔اللہ اللہ یا معشر المھاجرین لا تخربوا سلطان محمّد فی العرب عن دارہ و قعر بیتہ الی دورکم و قعور بیوتکم و لا تدعوا اٴھلہ عن مقامہ فی الناس و حقّہ، فو اللہ یا معشر المھاجرین لنحن اٴحق الناس بہ، لاٴنا اٴھل البیت و نحن اٴحقّ بھذا الاٴمر منکم ما کان فینا القاری لکتاب اللہ، الفقیہ فی دین اللہ، العالم بسنن اللہ، المضطلع باٴمر الرعیۃ، المدافع عنھم الاٴُمور السیئّۃ القسم بینھم بالسویۃ، و اللہ انّہ لفینا، فلا تتبعو الھوی فتضلوا عن سبیل اللہ فتزدادوا من الحقّ بعداً" (الامامۃ و السیاسۃ، ابن قتیبہ دینوری، ج1، ص12، احتجاج طبرسی، ج1، ص96)

56۔ اٴنا اٴولی برسول اللہ حیاً و میّتاً و اٴنا وصیّہ و وزیرہ و مستودع سرّہ و علمہ، و اٴنا الصّدیق الاٴکبر و الفاروق الاٴعظم، اٴوّل من آمن بہ و صدّقہ، و اٴحسنکم بلاءً فی جھاد المشرکین، و اٴعرفکم بالکتاب و السنۃ، اٴفقھکم فی الدین و اعلمکم بعواقب الاٴمور و اٴذربکم لساناً و اٴثبتکم جناناً فعلام تنازعو فی ھذا الاٴمر (احتجاج طبرسی، ج12، ص 95)

57۔نھج البلاغہ، عبدہ، خطبہ 168۔

58۔لامامۃ والسیاسۃ، ج1 ص12

59۔تاریخ طبری، ج3، ص234۔

60۔صحیح بخاری ج2، ص25۔

61۔صحیح بخاری، ج2، ص22۔

62۔شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج6، ص52، نقل از: کتاب السقیفہ، تالیف ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوھری۔

63۔احزاب/6

64۔مائدہ/48

65، التراتیب الاداریۃ، ج1، ص285۔

66۔التراتیب الاداریۃ، ج1، ص285۔

67۔سریہ اس جنگ کو کھتے ھیں جس میں آنحضرت شامل نہ تھے۔

68۔انبیاء/72، یوسف/22۔

69۔یوسف/101

70۔نحل/44

71۔جمعہ/2

72۔بقرہ/247

73۔احتجاج طبرسی، ج1، ص353، تلخیص کے ساتھ

74۔"ان الائمۃ فینا و ان الخلافۃ لا تصلح الّا فینا و انّ اللہ جعلنا اھلہ فی کتابہ وسنۃ نبیہ و ان العلم فینا و نحن اھلہ و انہ لا یحدث شیٔ الی یوم القیامۃ حتی ارش الخدش الّا وھو عندنا" (احتجاج طبری، ج3ص6)

75۔جب پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک کی جنگ پر جانے کا فیصلہ کیا تو، حضرت علی کو اپنا جانشین مقرر کر کے فرمایا" انت منی بمنزلۃ ھارون من موسی الّا انہ لا نبی بعدی" تم میرے لئے ویسے ھی ھو جیسے ھارون موسی کے لئے تھے، فرق صرف یہ ھے کہ میرے بعد کوئی نبی نھیں آئے گا ، پیغمبر اسلام نے اس جملہ سے ، نبوت کے علاوہ تمام منصبوں کو علی(ع) کے لئے ثابت کردیا

76۔حدیث غدیر کی تفصیل انیسویں فصل میں آئے گی۔

77۔یھاں مقصود حدیث ثقلین ھے کہ اس کے بارے میں بائیسوں فصل میں گفتگو آئے گی

۔

78۔پیغمبر نے اپنے اصحاب سے فرمایا: سلّموا علی علیؑ بامرۃ المؤمنین۔

79۔نساء/54

80۔نھج البلاغہ، خطبہ سوم

81۔حشر/7۔

82۔مسند احمد، ج1، 2۔14۔

83۔تاریخ الخلفاء، ص59۔66۔

84۔الغدیر ج7ص108

85۔سیرہ حلبی، ج3،ص34، بحار ج22،ص157۔

86۔مغازی واقدی، ج2،ص766، بحار، ج21،ص54۔

87۔انعام/164

88۔طبقات ابن سعد، ج3،ص151۔

89۔موطأابن مالک ص335۔

90۔سنن بیھقی، ج8 ص273۔

91۔سنن ابن ماجہ، ج1،ص200۔

92۔نساء43، مائدہ/6۔

93۔الدر المنثور ج1،ص21۔

94۔مسند احمد، ج1،ص192۔

95۔نساء/20

96۔"کل الناس افقہ من عمر"

97۔الغدیر، ج6 ص87 (اھل سنت کی مختلف اسناد سے منقول)

98۔اس کی تفصیل پانچویں فصل میں گزری ھے۔

99۔الاضواء، ص204

100۔سنن بیھقی، ج8 ص33۔

101۔توبہ/100۔

102۔فتح/18۔

103۔احزاب/12

104۔توبہ/47۔

105۔سیرہ ابن ھشام، ج2،ص430۔

106۔ چرا مسیحی نیستم

107۔حشر/8۔

108۔ (مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَ الَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللهِ وَ رِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ)(فتح/29)

109۔ (وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَ أَجْراً عَظِيماً) (فتح/29)

110۔توبہ/96۔

111۔آل عمران/57۔

112۔زمر/65

113۔نعام/93۔

114۔الاصابۃ، ج2،ص38

115۔ ان افراد میں سے ھر ایک کی زندگی کے حالات علم رجال کی کتابوں ، جیسے : الاستیعاب، الاصابۃ، اسد الغابۃ وغیرہ میں درج ھیں

116۔حجرات/6۔

117۔مذکورہ افراد ان منافقوں کے گروہ کے علاوہ ہیں جن کی داستان مفصل ہے۔

118۔انعام/88۔

119۔غایۃ المرام،ص107۔152۔

120۔المراجعات،ص131۔132

121۔صحیح بخاری ج3،ص58،صحیح مسلم ج2 ص323۔

122۔صحیح مسلم،ج7 ص120۔

123۔طٰہ/29۔30۔

124۔طٰہ/31۔

125۔طٰہ/32

126۔طہ/ 36اس کے علاوہ قرآن مجید ایک دوسری آیت میں حضرت ھارون (ع) کی نبوّت کے بارے میں صراحت سے فرماتا ھے:

(وَوَهَبْنَا لَهُ مِن رَّحْمَتِنَا أَخَاهُ هَٰرُونَ نَبِيًّا)(مریم/53)

127۔اعراف/ 142۔ایک اور آیت میں حضرت ھارون کی وزارت کے بارے میں صراحت سے فرماتا ھے:

(128)(فرقان/35)

129۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جملہ کو مختلف مواقع پر سات بار بیان فرمایا

ھے، لیکن ھم اختصار کی وجہ سے یھاں پر صرف دو مورد کا ذکر کرتے ھیں۔

130۔ کنز العمال، ج6، ص395، حدیث نمبر 6032۔

131۔ منتخب کنزل العمال (مسند کے حاشیہ میں) ج5، ص31

132۔ المراجعات/ص141، 147

133۔ جیسے، ورقۃ بن نوفل جس نے عیسائی کتابوں کے مطالعہ کے بعد بت پرستی کو چھوڑ کر عیسائی مذھب قبول کرلیا تھا۔

134۔ طور/30-32

135۔ سیرہ ابن ھشام، ج2، ص172

136۔ سیرہ ابن ھشام، ج1 ص386، 410

137۔ مائدہ/67

138۔ فخر رازی نے اپنی تفسیر (ج3، ص635) میں پیغمبر کی اس ماموریت کے بارے میں دس احتمالات بیان کئے ھیں جب کہ ان میں سے ایک احتمال بھی جبکہ ان کا کوئی صحیح ماخذ بھی نھیں ھے مذکورہ دو شرائط کا حامل نھیں ھے، جنھیں ھم نے مذکورہ آیت سے اس کے موضوع کے تحت بیان کیا ھے، ان میں سے زیادہ تر احتمالات ھرگز اس قدر اھم نھیں ھیں کہ ان کے نہ پھنچانے پر رسالت کو کوئی نقصان پھنچتا یا پیغامات کا پھنچانا خوف و وحشت کا سبب بن جاتا یہ احتمالات حسب ذیل ھیں:

1۔ یہ آیت، گناھگار مردوں اور عورتوں کو سنگسار کرنے کے بارے میں ھے۔

2۔ یہ آیت، یھودیوں کے پیغمبر پر اعتراض کے بارے میں نازل ھوئی ھے۔

3۔ جب قرآن مجید نے پیغمبر کی بیویوں کو تنبیہ کی کہ اگر وہ دنیا کے زروزیور کو چاھیں گی تو پیغمبر ان کو طلاق دیدیں گے، پیغمبر اس حکم الٰھی کو پھنچانے سے ڈرتے تھے کہ کھیں وہ دنیا کو ترجیح نہ دیں۔

4۔ یہ آیت، پیغمبر کے منہ بولے بیٹے زید کے واقعہ سے متعلق ھے کہ پیغمبر کو خدا کی طرف سے حکم ھوا کہ وہ زید کی طلاق یافتہ بیوی سے شادی کرلیں۔

5۔ یہ آیت لوگوں اور منافقین کو جھاد کی طرف دعوت دینے سے مربوط ھے۔

6۔ بتوں کی برائی کرنے سے پیغمبر کی خاموشی سے مربوط ھے۔

7۔ یہ آیت حجۃ الوداع میں اس وقت نازل ھوئی ھے جب پیغمبر شریعت اور مناسک بیان فرمارھے تھے۔

8۔ پیغمبر قریش، یھود اور نصاری سے ڈرتے تھے اس لئے یہ آیت آپ کے ارادے کو قوت بخشنے کے لئے نازل ھوئی ھے۔

9۔ ایک جنگ میں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت کے سایہ میں آرام فرمارھے تھے، ایک عرب ننگی تلوار لے کر پیغمبر پر حملہ آور ھوا اور آپ سے مخاطب ھو کر کھا: "اب تمھیں مجھ سے کون بچا سکتا ھے"، پیغمبر نے جواب میں فرمایا: "خدا" اس وقت دشمن پر خوف طاری ھوا وہ پیچھے ھٹ گیا اور اس کا سر درخت سے ٹکرا کر پھٹ گیا، اس وقت یہ آیت نازل ھوئی (واللہ یعصمک من الناس) آیہ شریفہ کے مفاد کا مذکورہ احتمالات کے مطابق ھونا (مثلاً

آخری احتمال) بھت بعید ھے جب کہ غدیر خم کے واقعہ کے ساتھ مطابقت رکھتا ھے۔

1۔مرحوم علامہ امینی نے ان تیس افراد کے نام اور خصوصیات اپنی تالیف، الغدیر، ج1،ص 196۔209۔میں مفصل بیان کئے ھیں ان میں ،طبری، ابونعیم اصفھانی، ابن عساکر، ابو اسحاق حموینی اور جلال الدین سیوطی وغیرہ جیسے افراد بھی شامل ھیں کہ انھوں نے ابن عباس، ابوسعید خدری اور براء بن عازب سے یہ حدیث نقل کی ھے۔

139۔خاص طور پر عرب قوم میں ھمیشہ بڑے عھدوں کوقبیلہ کے عمر رسیدہ لوگوں کے سپرد کرنے کی رسم تھی اور جوانوں کواس بھانے سے ایسے عھدے سونپنے کے قائل نہ تھے کہ جو ان زمانہ کا تجربہ نھیں رکھتے ھیں۔لھذا جب پیغمبر نے "عتاب بن ولید" کومکہ کا گورنراوراسامہ کوسپہ سالار مقرر فرمایا توعمر رسیدہ لوگوں نے آپ پر اعتراض کیا پھرلوگ اس امر کی طرف توجہ نھیں دیتے کہ حضرت علی (ع) دیگر جوانوں سے مختلف ھیں، یہ لائق اورشائستہ شخص الھی عنایتوں کے سایہ میں ایسے مقام تک پھنچا ھوا ھے کہ ھرقسم کی خطا اورلغزشوں سے محفوظ ھے اورھمیشہ عالم بالا سے امداد حاصل کرتا ھے۔

140۔احمد بن حنبل کا کھنا ہے کہ پیغمبر نے اس جملہ کو چار بار فرمایا

141۔ (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلاٰمَ دِیْناً)(مائدہ/3)

142۔فقال لہ قم یاعلی فاننی

رضیتک من بعدی اماماً وھادیا

فمن کنت مولاہ فھذا ولیہ

فلو نولہ اتباع صدق موالیا

143۔احتجاج طبرسی، ج1 ص71 تا74 طبع، نجف۔

144۔ آیه، (يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ") (مائدہ/ 67)، اور آیه شریفه (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي ") (مائدہ /3)

145۔وفیات الاعیان، ج1، ص60۔

146۔وفیات الاعیان، ج1، ص223۔

147۔التنبیہ والاشراف، ص22۔

148۔ثمارۃ القلوب، ص511۔

149۔حدید/15

150۔ای اولی لکم ما اسلفتم من الذنوب۔

151۔حج/13۔

152۔احزاب6

153۔مناقب خوارزمی ص80 وغیرہ۔

154۔حجرات/15

155۔توبہ/71

اکیسویں فصل

دو سوالوں کے جواب

دوسوال

پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی ں کی بلافصل خلافت کا اعلان غدیر خم میں کر دیا اور ان کی اطاعت و پیروی تمام مسلمانوں پر لازم و واجب قرار دے دی۔ یھاں دو سوال سامنے آتے ھیں۔

1۔ جب حضرت علی ں کی جانشینی کا اعلان ایسے مخصوص دن کر دیا گیا تھا تو پھر اصحاب نے

آنحضرت کی رحلت کے بعد حضرت علیں کی وصایت وولی عهدی کواندیکھا کرتے هوئے کسی اورکی پیروی کیوں کی؟

2۔امام علی علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اپنی امامت کوثابت کرنے کے لئے اس حدیث سے استدلال کیوں نهیں کیا؟

پهلے سوال کا جواب:

اگر چہ اصحاب پیغمبر کے ایک گروہ نے حضرت علی ں کی جانشینی کوفراموش کرتے هوئے غدیر کے الٰهی فرمان سے چشم پوشی کرلی اور بهت سے لاتعلق ولا پرواہ لوگوں نے --جن کی مثالیں هر معاشرہ میں بهت زیادہ نظر آتی هیں-------ان لوگوں کی پیروی کی ،لیکن ان کے مقابل ایسی نمایاں شخصیتیں اوراهم افراد بهی تهے جو حضرت علیں کی امامت و پیشوائی کے سلسلہ میں وفادار رهے ۔اورانهوں نے امام علی ں کے علاوہ کسی اورکی پیروی نهیں کی ۔ یہ افراد اگر چہ تعداد میں پهلے گروہ سے کم اوراقلیت شمار هوتے تهے،لیکن کیفیت وشخصیت کے اعتبار سے پیغمبراکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ممتاز اصحاب میں شمار هوتے تهے جیسے :سلمان فارسی ،ابوذرغفاری ،مقداد بن اسود ،عمار یاسر،ابی بن کعب ،ابوایوب انصاری ،خزیمہ بن ثابت ،بریدہ اسلمی ، ابوهثیم بن التیهان،خالد بن سعید اور ایسے هی بهت سے افراد کہ تاریخ اسلام نے ان کے نام اوران کی زندگی کے خصوصیات ونیک صفات ،موجودہ خلافت پران کی تنقیدیں اورامیر المومنین علی ں سے ان کی وفاداریوں کو پوری باریکی کے

ساتھ محفوظ کیا ھے۔

تاریخ اسلام نے دوسو پچاس صحابیوں کا ذکر کیا ھے کہ یہ سب کے سب امام کے وفادار تھے اور زندگی کے آخری لمحہ تک ان کے دامن سے وابستہ رھے۔ ان میں سے بھت سے لوگوں نے امام کی محبت میں شھادت کا شرف بھی حاصل کیا۔(156)

افسوس کے ساتھ کھنا پڑتا ھے کہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی وصایت وولایت کا مسئلہ ھی نھیں ھے جس میں آنحضرت کے صریح وصاف حکم کے باوجود پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعض صحابیوں نے مخالفت اور آنحضرت کے حکم سے چشم پوشی کی ، بلکہ تاریخ کے صفحات کی گواھی کے مطابق خود پیغمبر کے زمانہ میں بھی بعض افراد نے آنحضرت کے صاف حکم کو اندیکھا کیا، اس کی مخالفت کی اور اس کے خلاف اپنے نظریہ کا اظھار کیا۔

دوسری لفظوں میں پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعض اصحاب جب آنحضرت کے حکم کو اپنے باطنی خواھشات اور سیاسی خیالات کے مخالف نھیں پاتے تھے تو دل سے اسے قبول کر لیتے تھے۔ لیکن اگر پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات کے کسی حصہ کو اپنے سیاسی افکار وخیالات اور اپنی جاہ پسند خواھشات کے خلاف پاتے تھے تو پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کام کی انجام دھی سے روکنے کی کوشش کرتے تھے اور اگر پیغمبر اپنی بات پر جمے رھتے تو آنحضرت کے حکم سے سرتابی کی کوشش کرتے تھے یا اعتراض کرنے لگتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ خود پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی پیروی کریں۔

ذیل میں ھم بعض اصحاب کی اس ناپسندیدہ روش کے چند نمونے بیان کرتے ھیں:

1۔ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حکم دیا کہ میرے لئے قلم و دوات لے آؤ تا کہ میں ایک ایسی تحریر لکہ دوں جس کی روشنی میں میرے بعد میری امت کبھی گمراہ نہ ھو۔ لیکن وھاں موجود بعض افراد نے اپنی مخصوص سیاسی سوجہ بوجہ سے یہ سمجھ لیا کہ اس تحریر کا مقصد اپنے بعد کے لئے جانشین کے تعین کا تحریری اعلان ھے لھذا پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صریحی حکم کی مخالفت کر بیٹھے اور لوگوں کو قلم و کاغذ لانے سے روک دیا!

ابن عباس نے اپنی آنکھوں سے اشک بھاتے ھوئے کھا: مسلمانوں کی مصیبت اور بدبختی اسی روز سے شروع ھوئی جب پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیمار تھے اور آپ نے اس وقت قلم کاغذ لانے کا حکم دیا تا کہ ایسی چیز لکہ دیں کہ ان کے بعد امت اسلام گمراہ نہ ھو۔ لیکن اس موقع پر بعض حاضرین نے جھگڑا اور اختلاف شروع کر دیا۔ بعض لوگوں نے کھا: قلم، کاغذ لے آؤ بعض نے کھا نہ لاؤ۔ آخر کار پیغمبر نے جب یہ جھگڑا اور اختلاف دیکھا تو جو کام انجام دینا چاھتے تھے نہ کر سکے۔ (157)

2۔ مسلمانوں کے لشکر کے سردار "زید بن حارثہ" رومیوں کے ساتھ، جنگ موتہ میں قتل ھو گئے اس واقعہ کے بعد پیغمبر اسلام (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک فوج تشکیل دی اور مھاجرین وانصار کی تمام شخصیتوں کو اس میں شرکت کا حکم دیا اور لشکر کا علم اپنے ھاتھوں سے "اسامہ ابن زید" کے حوالے کیا۔ ناگھاں اسی روز آنحضرت کو شدید

بخار آیا جس نے آنحضرت کو سخت مریض کر دیا۔اس دوران پیغمبر کے بعض اصحاب کی جانب سے اختلاف ،جھگڑے اور پیغمبر خدا کے صاف حکم سے سر تابی کا آغاز هوا۔بعض لوگوں نے "اسامہ" جیسے جوان کی سرداری پر اعتراض کرتے هوئے اپنے غصہ کا اظهار کیا اور آنحضرت سے اس کی معزولی کا مطالبہ کیا۔ ایک گروہ جن کے لئے آنحضرت کی موت قطعی هوچکی تھی، جهاد میں جانے سے ٹال مٹول کرنے لگا کہ ایسے حساس موقع پر مدینہ سے باهر جانا اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اچھا نهیں۔

پیغمبر اسلام (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بھی اپنے اصحاب کی اس ٹال مٹول اور لشکر کی روانگی میں تاخیر سے آگاہ هوتے تھے تو آپ کی پیشانی اور چھرہ سے غصہ کے آثار ظاهر هونے لگتے تھے اور اصحاب کو آمادہ کرنے کے لئے دوبارہ تاکید کے ساتھ حکم دیتے تھے اور فرماتے تھے : جلد از جلد مدینہ ترک کرو اور روم کی طرف روانہ هوجاؤ۔لیکن اس قدر تاکیدات کے باوجود ان هی اسباب کے پیش نظر جو اوپر بیان هوچکے هیں،ان افراد نے آنحضرت کے صاف وصریح حکم کو ان سنا کر دیا اور اپنی ذاتی مرضی آگے پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیهم تاکیدات کو ٹھکرا دیا۔

3۔پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرمان سے بعض اصحاب کی مخالفت کے یهی دو مذکورہ نمونے نهیں هیں۔ اس قسم کے افراد نے سرزمین "حدیبیہ" پر بھی، جب آنحضرت قریش سے صلح کی قرارداد باندہ رهے تھے، سختی کے ساتھ آنحضرت کی مخالفت کی اور ان پر اعتراض اور تنقیدیں کیں۔

پیغمبر اسلام (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی رحلت کے بعد ان لوگوں کی آنحضرت کے دستورات سے مخالفت اس سے زیادہ ھے۔ کیونکہ ان ھی افراد نے بعض اسباب کے تحت نماز اوراذان کی کیفیت میں تبدیلی

کردی"از دواج موقت" کی آیت کوان دیکھا کردیا ماہ رمضان مبارک کی شبوں کے نوافل کوجنھیں فرادیٰ پڑھنا چاھئے ایک خاص کیفیت کے ساتھ جماعت میں تبدیل کردیا اور میراث کے احکام میں بھی تبدیلیاں کیں۔

ان میں سے ھرایک تبدیلیوں اورتحریفوں اورآنحضرت کے حکم سے ان سرتابیوں کے اسباب وعلل اور اصطلاحی طور سے "نص کے مقابلہ میں اجتھاد" کی تشریح اس کتاب میں ممکن نھیں ھے۔ اس سلسلہ میں کتاب "المراجعات" کے صفحات 218-282 تک اور ایک دوسری کتاب "النص والاجتھاد" کا مطالعہ مفید ھوگا، جواسی موضوع سے متعلق لکھی گئی ھے۔

اصحاب پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی مخالفت اور شرارت اس قدر بڑہ گئی تھی کہ قرآن مجید نے انھیں سخت انداز میں رسول خدا (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دستورات سے مخالفت اوران پرسبقت کرنے سے منع کیا چنانچہ فرماتا ھے:

"فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنة او یصیبھم عذاب الیم" (158)

یعنی جولوگ رسول خدا (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرمان کی مخالفت کرتے ھیں وہ اس بات سے ڈریں کہ کھیں کسی بلا یا دردناک عذاب میں مبتلا نہ ھوں۔

اورفرماتا ھے:

"یا ا ٔیھا الذین آمنوا لا تقدموا بین یدی اللہ و رسولہ واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم" (159)

اے ایمان لانے والو! خدا اور اس کے رسول پر سبقت نہ کرو اور اللہ سے ڈرو کہ بلا شبہ اللہ سننے اور جاننے والا ھے۔

جو لوگ یہ اصرار کرتے تھے کہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے نظریات وخیالات کی پیروی کریں خداوند عالم انھیں بھی وارننگ دیتا ھے:

"واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم" (160)

اور جان لو کہ تمھارے درمیان رسول خدا جیسی شخصیت موجود ھے۔ اگر بھت سے امور میں وہ تمھارے نظریات کی پیروی کریں گے تو تم زحمت میں پڑ جاؤ گے۔

یہ حادثات اور یہ آیات اس بات کی صاف حکایت کرتی ھےں کہ اصحاب پیغمبر میں ایک گروہ تھا جو آنحضرت کی مخالفت کرتا تھا اور جیسی ان کی اطاعت کرنا چاھئے اطاعت نھیں کرتا تھا ۔ بلکہ یہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ جو احکام الٰھی ان کے افکار اور سلیقہ سے سازگار نھیں تھے، ان کی پیروی نہ کریں۔ حتیٰ یہ کوشش کرتے تھے کہ خود رسول خدا کو اپنے نظریات کا پیرو بنائیں۔

افسوس رسول خدا (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد سیاسی میدان میں دوڑنے والے اور سقیفہ نیز فرمائشی شوریٰ کی تشکیل دینے والے یھی لوگ جنھوں نے غدیر خم میں پیغمبر اسلام (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صاف حکم اور نص الٰھی کو اپنی باطنی خواھشات کے مخالف پایا لھذا بھت تیزی سے اسے بھلا دیا۔

دوسرے سوال کا جواب:

جیسا کہ اس سوال میں در پردہ ادعا کیا گیا ھے، یہ یاددلانا ضروری ھے کہ حضرت علی ں نے اپنی زندگی میں متعدد موقعوں پر حدیث غدیر کے ذریعہ اپنی حقانیت اور اپنی خلافت پر استدلال کیا ھے۔حضرت امیرالمومنین جب بھی موقع مناسب دیکھتے تھے مخالفوں کو حدیث غدیر یاددلاتے تھے۔اس طرح سے اپنی حیثیت لوگوں کے دلوں میں محکم فرماتے تھے اور حقیقت کے طالب افراد پر حق کو آشکار کردیتے تھے۔

نہ صرف حضرت امام علی (ع) بلکہ بنت رسول خدا حضرت فاطمہ زھرا (ع) اوران کے دونوں صاحب زادوں امام حسن اور امام حسین علیھما السلام اور اسلام کی بھت سی عظیم شخصیتوں مثلاً عبداللہ بن جعفر، عمار یاسر، اصبغ بن نباتہ، قیس بن سعد، حتیٰ کچھ اموی اور عباسی خلفاء مثلاً عمر بن عبدالعزیز اور مامون الرشید اوران سے بھی بالاتر حضرت (ع) کے مشھور مخالفوں مثلا عمروبن عاص اور....نے حدیث غدیر سے احتجاج واستدلال کیا ھے۔

حدیث غدیر سے استدلال حضرت علی (ع) کے زمانہ سے آج تک جاری ھے اور ھر زمانہ وھر صدی میں حضرت (ع) کے دوست داروں نے حدیث غدیر کو حضرت کی امامت وولایت کے دلائل میں شمار کیا ھے۔ھم یھاں ان احتجاجات اور استدلالوں کے صرف چند نمونے پیش کرتے ھیں:

1۔سب جانتے ھیں کہ خلیفہ دوم کے حکم سے بعد کے خلیفہ کے انتخاب کے لئے چہ رکنی کمیٹی

تشکیل پائی تھی کمیٹی کے افراد کی ترکیب ایسی تھی کہ سبھی جانتے تھے کہ خلافت حضرت علی (ع) تک نھیں پھنچے گی کیونکہ عمر نے اس وقت کے سب سے بڑے سرمایہ دار عبد الرحمان بن عوف (جو عثمان کے قریبی رشتہ دار تھے) کو ویٹو پاور دے رکھا تھا۔ان کا حضرت علی (ع) کے مخالف گروہ سے جو رابطہ تھا اس سے صاف ظاھر تھا کہ وہ حضرت علی (ع) کو اس حق سے محروم کردیں گے۔

بھر حال جب خلافت عبد الرحمان بن عوف کے ذریعہ عثمان کو بخش دی گئ تو حضرت علی (ع) نے شوریٰ کے اس فیصلہ کو باطل قرار دیتے ھوئے فرمایا: میں تم سے ایک ایسی بات کے ذریعہ احتجاج کرتا ھوں جس سے کوئی شخص انکار نھیں کرسکتا یھاں تک کہ فرمایا: میں تم لوگوں کو تمھارے خدا کی قسم دیتا ھوں کیا تمھارے درمیان کوئی ایسا شخص ھے جس کے بارہ میں پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا

"من کنت مولاہ فھذا علیّ مولاہ، اللّٰھم وال من والاہ وانصر من نصرہ لیبلغ الشاھد الغائب"

یعنی میں جس جس کا مولا ھوں یہ علی (ع) بھی اس کے مولا ھیں۔خدایا تو اسے دوست رکھ اور اس کی مدد فرما جو علی (ع) کی مدد کرے۔حاضرین ھر بات غائب لوگوں تک پھنچا ئیں۔

اس موقع پر شوریٰ کے تمام ارکان نے حضرت علی (ع) کی تصدیق کرتے ھوئے کھا: خدا کی قسم یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی اور میں نھیں پائی جاتی۔(161)

امام علی (ع) کا احتجاج واستدلال اس حدیث سے صرف اسی ایک موقع پر نھیں تھا بلکہ امام نے حدیث غدیر سے دوسرے مقامات پر بھی استدلال فرمایا ھے۔

2۔ایک روز حضرت علی ں کوفہ میں خطبہ دے رھے تھے۔تقریر کے دوران آپ نے مجمع سے خطاب کر کے فرمایا: میں تمھیں خدا کی قسم دیتا ھوں، جوشخص بھی غدیرخم میں موجود تھااور جس نے اپنے کانوں سے سنا ھے کہ پیغمبراکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا ھے وہ کھڑے ھوکر گواھی دے۔لیکن صرف وھی لوگ کھڑے ھوں جنھوں نے خود اپنے کانوں سے پیغمبر (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے یہ بات سنی ھے۔وہ نہ اٹھیں جنھوں نے دوسروں سے سنا ھے۔اس وقت تیس افراد اپنی جگہ پر کھڑے ھوئے اور انھوں نے حدیث غدیر کی گواھی دی۔

یہ بات ملحوظ رکھنی چاھئے کہ جب یہ بات ھوئی تو غدیر کے واقعہ کوگزرے ھوئے پچیس سال ھوچکے تھے۔اور پیغمبر (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بھت سے اصحاب کوفہ میں نھیں تھے، یا اس سے پھلے انتقال کر چکے تھے اور کچھ لوگوں نے بعض اسباب کے تحت گواھی دینے سے کوتاھی کی تھی۔

"علامہ امینی" مرحوم نے اس احتجاج و استدلال کے بھت سے حوالے اپنی گرانقدر کتاب "الغدیر" میں نقل کئے ھیں۔شائقین اس کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ھیں۔(162)

3۔حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں مھاجرین وانصار کی دوسو بڑی شخصیتیں مسجد نبی میں جمع ھوئیں۔ان لوگوں نے مختلف موضوعات پر گفتگو شروع کی۔یھاں تک کہ بات قریش کے فضائل ان کے کارناموں اور ان کی ھجرت کی آئی اور قریش کا ھر خاندان اپنی نمایاں شخصیتوں کی تعریف کرنے لگا۔جلسہ صبح سے ظھر تک چلتا رھا اور لوگ باتیں کرتے رھے

حضرت امیر المومنین (ع) پورے جلسہ میں صرف لوگوں کی باتیں سنتے رھے۔اچانک مجمع آپ (ع) کی طرف متوجہ ھوا اور درخواست کرنے لگا کہ آپ بھی کچھ فرمایئے۔امام علیہ السلام لوگوں کے اصرار پر اٹھے اور خاندان پیغمبر (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنے رابطہ اور اپنے درخشاں ماضی سے متعلق تفصیل سے تقریر فرمائی۔یھاں تک کہ فرمایا:

کیا تم لوگوں کو یاد ھے کہ غدیر کے دن خداوند عالم نے پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ حکم دیا تھا کہ جس طرح تم نے لوگوں کو نماز، زکات اور حج کی تعلیم دی یوں ھی لوگوں کے سامنے علی (ع) کی پیشوائی کا بھی اعلان کردو۔اسی کام کے لئے پیغمبر (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں فرمایا: خداوند عالم نے ایک فریضہ میرے اوپر عائد کیا ھے۔میں اس بات سے ڈرتا تھا کہ کھیں اس الٰھی پیغام کو پھنچانے میں لوگ میری تکذیب نہ کریں، لیکن خدواند عالم نے مجھے حکم دیا کہ میں یہ کام انجام دوں اور یہ خوش خبری دی کہ اللہ مجھے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

اے لوگو! تم جانتے ھو کہ خدا میرا مولا ھے اور میں مومنین کا مولا ھوں اور ان کے حق میں ان سے زیادہ اولیٰ بالتصرف ھوں؟ سب نے کھا ھاں۔اس وقت پیغمبر اسلام (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے فرمایا: علی! اٹھو۔میں اٹہ کھڑا ھوا۔آنحضرت نے مجمع کی طرف رُخ کر کے فرمایا: "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ" جس کا میں مولا ھوں اس کے یہ علی (ع) مولا ھیں۔خدایا! تو اسے دوست رکہ جو علی (ع) کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکہ جو علی (ع) سے دشمنی کرے۔

اس موقع پر سلمان فارسی نے رسول خدا (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے دریافت کیا: علی (ع) ھم پر کیسی ولایت رکھتے ھیں؟ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے فرمایا: "ولاءٔ کولائی، من کنت اولی بہ من نفسہ، فعلیّ اولی بہ من نفسہ" یعنی تم پر علی (ع) کی ولایت میری ولایت کے مانند ھے۔ میں جس جس کی جان اور نفس پر اولویت رکھتا ھوں علی (ع) بھی اس کی جان اور اس کے نفس پر اولویت رکھتے ھیں۔ (163)

4۔ صرف حضرت علی ں نے ھی حدیث غدیر سے اپنے مخالفوں کے خلاف احتجاج و استدلال نھیں کیا ھے بلکہ پیغمبر اسلام (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی پارۂ جگر حضرت فاطمہ زھرا سلام اللہ علیھا نے ایک تاریخی دن جب آپ اپنے حق کو ثابت کرنے کے لئے مسجد میں خطبہ دے رھی تھیں، تو

پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے اصحاب کی طرف رخ کر کے فرمایا:

کیا تم لوگوں نے غدیر کے دن کو فراموش کر دیا جس دن پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے حضرت علی (ع) کے بارے میں فرمایا تھا:

"من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ"

جس کا میں مولا ھوں یہ علی اس کے مولا ھیں.

5۔ جس وقت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کی قرارداد باندھنے کا فیصلہ کیا تو مجمع میں کھڑے ھوکر ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

"خداوند عالم نے پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے اھل بیت (ع) کو اسلام کے

ذریعہ مکرم اور گرامی قرار دیا ھمیں منتخب کیا اور ھر طرح کی رجس و کثافت کو ھم سے دور رکھا......
یھاں تک کہ فرمایا: پوری امت نے سنا کہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی ں سے فرمایا: تم کو مجھ سے وہ نسبت ھے جو ھارون کو موسی (ع) سے تھی“
تمام لوگوں نے دیکھا اور سنا کہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غدیر خم میں حضرت علیں کا ھاتہ تھام کر لوگوں سے فرمایا:
"من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ" (164)
6۔امام حسین علیہ السلام نے بھی سرزمین مکہ پر حاجیوں کے مجمع میں جس میں اصحاب پیغمبر (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک بڑی تعداد موجود تھی ---خطبہ دیتے ھوئے فرمایا:
”میں تمھیں خدا کی قسم دیتا ھوں کیا تم جانتے ھو کہ پیغمبر اسلام نے غدیر کے دن حضرت علی ں کو اپنی خلافت و ولایت کے لئے منتخب کیا اور فرمایا کہ: حاضرین یہ بات غائب لوگوں تک پھنچا دیں“؟ پورے مجمع نے کھا: ھم گواھی دیتے ھیں۔
7۔ان کے علاوہ جیسا کہ ھم عرض کر چکے ھیں، پیغمبر اسلام (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کئی اصحاب مثلاً عمار یاسر، زید بن ارقم، عبداللہ بن جعفر، اصبغ بن نباتہ اور دوسرے افراد نے بھی حدیث غدیر کے ذریعہ حضرت علی ں کی خلافت و امامت پر استدلال کیا ھے۔(165)

بائیسویں فصل

حدیث "ثقلین" اور حدیث "سفینہ" قرآن و عترت کا باہم اٹوٹ رشتہ

حدیث ثقلین (166) اسلام کی ان قطعی ومتواتر احادیث میں سے ہے جسے علمائے اسلام نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نقل کیا ہے۔مختلف زمانوں اورصدیوں میں اس حدیث کے متعدد اور قابل اعتماد اسناد پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث کو قطعی ثابت کرتے ہیں اورکوئی بھی صحیح فکر اور صحیح مزاج والا شخص اس کی صحت واستواری میں

شک نہیں کرسکتا۔

علمائے اہل سنت کے نقطہ نظر سے اس حدیث کا جائزہ لینے سے پہلے ہم ان سے بعض افراد کی گواہی یہاں نقل کرتے ہیں:

"مناوی" کے بقول: یہ حدیث ایک سوبیس (120) سے زیادہ صحابیوں نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نقل کی ہے۔(167)

ابن حجر عسقلانی کے بقول: حدیث ثقلین بیس (20) سے زیادہ طریقوں سے نقل ہوئی ہے(168)

عظیم شیعہ عالم علامہ میر حامد حسین مرحوم، جن کا انتقال 1306ء ہ میں ہوا ہے، انھوں نے مذکورہ حدیث کو علمائے اہل سنت کی 502 کتابوں سے نقل کیا ہے۔ حدیث کی سند اور دلالت سے متعلق ان کی تحقیق چھ جلدوں میں اصفہان سے شائع ہو چکی ہے، شائقین اس کتاب کے ذریعہ اس حدیث کی عظمت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم اہل سنت کے مذکورہ راویوں پر شیعہ راویوں کا اضافہ کردیں تو حدیث ثقلین معتبر اور متواتر ہونے کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ پر نظر آتی ہے، جس کے اعتبار کا مقابلہ حدیث غدیر کے علاوہ کسی اور حدیث سے نہیں کیا جاسکتا۔ حدیث ثقلین کا متن یہ ہے

"انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله و عترتی اهل بيتی ما ان تمسكتم بهما لن تضلوا ابدا ولن يفترقا حتیٰ يردا علی الحوض"

"میں تمھارے درمیان دو گرانقدر امانتیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت و اہل بیت (ع) ہیں، جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے

ھرگز گمراہ نہ ھوگے یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ھوں گے، یھاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پہ پھنچ جائیں"

البتہ یہ حدیث اس سے بھی وسیع انداز میں نقل ھوئی ھے۔حتی ابن حجر نے لکھا ھے کہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس حدیث کے آخر میں اضافہ فرمایا:

"ھٰذا علی من القرآن و القرآن مع علی لا یفترقان" (169)

"یعنی یہ علی ھمیشہ قرآن کے ساتھ ھیں اور قرآن علی کے ھمراہ ھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نھیں ھوں گے"

مذکورہ بالا روایت حدیث کی وہ مختصر صورت ھے جسے اسلامی محدثوں نے نقل کیا ھے اور اس کی صحت پر گواھی دی ھے۔لیکن حدیث کی صورت میں اختلاف کی وجہ یہ ھے کہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مختلف موقعوں پر الگ الگ تعبیروں میں لوگوں کو قرآن و اھل بیت (ع) کے اٹوٹ رشتہ سے آگاہ کیا ھے۔ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان دونوں حجتوں کے ربط کو حجۃ الوداع کے موقع پر غدیر خم (170) میں۔ منبر پر (171)، اور بستر بیماری پر (172) جب کہ آپ کا حجرہ اصحاب سے بھرا ھوا تھا، بیان کیا تھا۔ اور اجمال و تفصیل کے لحاظ سے حدیث کے اختلاف کی وجہ یہ ھے کہ آنحضرت نے اسے مختلف تعبیروں سے بیان کیا ھے

اگر چہ حدیث مختلف صورتوں سے نقل ھوئی ھے اور پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی دو یادگاروں کو کبھی "ثقلین" کبھی "خلیفتین" اور کبھی "امرین" کے الفاظ سے یاد کیا ھے،

اس کے باوجود سب کا مقصد ایک ھے اور وہ ھے قرآن کریم اور پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عترت واھل بیت (ع) کے درمیان اٹوٹ رابطہ کا ذکر۔

حدیث ثقلین کا مفاد

حدیث ثقلین کے مفاد پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ھوتی ھے کہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی عترت و اھل بیت (ع) گناہ تو گناہ خطا ولغزش سے بھی محفوظ و معصوم ھیں ،کیوں کہ جو چیز صبح قیامت تک قرآن کریم سے اٹوٹ رشتہ ورابطہ رکھتی ھے وہ قرآن کی ھی طرح (جسے خداوند عالم نے ھر طرح کی
تحریف سے محفوظ رکھا ھے) ھر خطا ولغزش سے محفوظ ھے۔

دوسرے لفظوں میں یہ جو پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اسلامی امت صبح قیامت تک (جب یہ دونوں یادگاریں پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کریں گی)ان دونوں سے وابستہ رھے اوران دونوں کی اطاعت وپیروی کرے،اس سے یہ بات اچھی سمجھی جاسکتی ھے کہ یہ دونوں الٰھی حجتیں اور پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یادگاریں ،ھمیشہ خطا وغلطی سے محفوظ اور ھر طرح کی کجی وانحراف سے دور ھیں ۔کیوں کہ یہ تصور نھیں کیا جاسکتا کہ خداوند عالم کسی عاصی وگناھگار انسان کی اطاعت ھم پر واجب کرے یا قرآن مجید جیسی خطا سے پاک کتاب کا کسی خطا کار گروہ سے اٹوٹ رشتہ قرار دے دے ۔قرآن کا ھمسر اوراس کے برابر تتھا وھی گروہ ھوسکتا ھے جو ھر گناہ اور ھر خطا ولغزش سے پاک

ھو۔

جیسا کہ ھم پھلے عرض کر چکے ھیں، امامت کے لئے سب سے اھم شرط عصمت یعنی گناہ وخطا سے اس کا محفوظ رھنا ھے۔ آگے بھی ھم عقل کی روشنی میں الٰھی پیشواؤں اوررھبروں کے لئے اس کی ضرورت پر ثبوت فراھم کریں گے حدیث ثقلین بخوبی اس بات کی گواہ ھے کہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عترت واھل بیت (ع) قرآن کی طرح ھر عیب ونقص، خطا و گناہ سے پاک ھیں اور چونکہ ان کی پیروی واجب کی گئی ھے لھذا انھیں بھر حال گناہ و معصیت سے پاک ھونا چاھئے۔

امیر المؤمنین (ع) کا حدیث ثقلین سے استدلال

کتاب "احتجاج" کے مولف احمد بن علی ابن ابیطالب کتاب "سلیم بن قیس" سے (جو تابعین میں ھیں اور حضرت امیر المومنین کے عظیم شاگرد ھیں) نقل کرتے ھیں کہ عثمان کی خلافت کے دور میں مسجد النبی میں مھاجرین وانصار کا ایک جلسہ ھوا جس میں ھر شخص اپنے فضائل و کمالات بیان کر رھا تھا۔ اس جلسہ میں امام علیں بھی موجود تھے لیکن خاموش بیٹھے ھوئے سب کی باتیں سن رھے تھے۔ آخر کار لوگوں نے امام (ع) سے درخواست کی کہ آپ (ع) بھی اپنے بارہ میں کچھ بیان کریں، امام نے ایک تفصیلی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں چند آیات کی تلاوت بھی فرمائی جو آپ کے حق میں نازل ھوئی تھی اس کے ساتھ ھی آپ نے ارشاد فرمایا: میں تمھیں خدا کی قسم دیتا ھوں کیا تم جانتے ھو کہ رسول خدا نے اپنی زندگی کے

آخری ایام میں خطبہ دیا تھا اور اس میں فرمایا تھا:

" یا ائیھا الناس انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی فتمسکوا بھما لاتضلوا "

"اے لوگو! میں تمھارے درمیان دوگرانقدر میراث چھوڑے جارھا ھوں۔اللہ کی کتاب اور میرے اھل بیت (ع) پس ان دونوں سے وابستہ رھو کہ ھرگز گمراہ نہ ھوگے۔(173)

مسلم ھے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عترت و اھل بیت (ع) سے مراد ان سے وابستہ تمام افراد نھیں ھیں کیوں کہ امت کا اس پر اتفاق ھے کہ تمام وابستہ افراد لغزش و گناہ سے پاک ومبرا نھیں تھے بلکہ اس سے مراد وہ معین تعداد ھے جن کی امامت پر شیعہ راسخ عقیدہ رکھتے ھیں۔

دوسرے لفظوں میں اگر ھم حدیث ثقلین کے مفاد کو قبول کرلیں تو عترت و اھل بیت کے افراد اور ان کے مصداق مخفی نھیں رہ جائیں گے کیوں کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرزندوں یا ان سے وابستہ افراد کے درمیان صرف وھی لوگ اس حدیث کے مصداق ھو سکتے ھیں جو ھر طرح کی لغزش وخطا سے مبرا و پاک ھیں اور امت کے درمیان طھارت، پاکیزگی ،اخلاقی فضائل اور وسیع وبیکراں علم کے ذریعہ مسلمانوں میں مشھور ھیں اور لوگ انھیں نام و نشان کے ساتھ پھچانتے ھیں۔

ایک نکتہ کی یاددھانی

اس مشھور اور متفق علیہ حدیث یعنی حدیث ثقلین کا متن بیان ھو چکا اور ھم نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ھر جگہ "کتاب وعترت" کو اپنی دو یادگار کے عنوان سے یاد کیا ھے اور ان دو الٰھی حجتوں کے باھم اٹوٹ رشتہ کو ذکر کیا ھے لیکن سنت کی بعض کتابوں میں کھیں کھیں ندرت کے ساتھ "کتاب اللہ وعترتی" کے بجائے "کتاب اللہ وسنتی" ذکر ھوا ھے اور ایک غیر معتبر روایت کی شکل میں نقل ھوا ھے۔

ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب میں حدیث کی دوسری صورت بھی نقل کی ھے اور اس کی توجیہ کرتے ھوئے لکھا ھے کہ: درحقیقت سنت پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو قرآنی آیات کی مفسر ھے اس کی بازگشت خود کتاب خدا کی طرف ھے اور دونوں کی پیروی لازم وواجب ھے۔

ھمیں اس وقت اس سے سروکار نھیں کہ یہ توجیہ درست ھے یا نھیں۔ جو بات اھم ھے یہ ھے کہ حدیث ثقلین جسے عام طور سے اسلامی محدثوں نے نقل کیا ھے وہ وھی "کتاب اللہ وعترتی" ھے اور اگر جملہ "کتاب اللہ وسنتی" بھی پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صحیح ومعتبر سند کے ساتھ نقل ھوئی ھوگی تو وہ ایک دوسری حدیث ھوگی۔ جو حدیث ثقلین سے کوئی ٹکراؤ نہ رکھے گی۔ جبکہ یہ تعبیر احادیث کی کتابوں میں کسی قابل اعتماد سند کے ساتھ نقل نھیں ھوئی ھے۔ اور جو شھرت وتواتر پھلی بایوں کھا جائے کہ اصل حدیث ثقلین کو حاصل ھے وہ اسے حاصل نھیں ھے۔

عترت پیغمبر سفینۂ نوح کے مانند

اگر حدیث سفینہ کو حدیث ثقلین کے ساتھ ضم کر دیا جائے تو ان دونوں حدیثوں کا مفاد پیغمبر اسلام (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اھل بیت (ع) کے لئے فضائل و کمالات کی ایک دنیا کو نمایاں کرتا ھے۔

سلیم ابن قیس نے لکھا ھے کہ: میں حج کے زمانہ میں مکہ میں موجود تھا. میں نے دیکھا کہ جناب ابوذر غفاری کعبہ کے حلقہ کو پکڑے ھوئے بلند آواز میں کھہ رہے ھیں:

اے لوگو! جو مجھے پھچانتا ھے وہ پھچانتا ھے اور جو نھیں پھچانتا میں اسے اپنا تعارف کراتا ھوں۔ میں جندب بن جنادہ "ابوذر" ھوں. اے لوگو! میں نے پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ھے کہ"

"ان مثل اھل بیتی فی امتی کمثل سفینة نوح فی قومه من رکبها نجیٰ ومن ترکها غرق"

میرے اھل بیت کی مثال میری امت میں جناب نوح کی قوم میں ان کی کشتی کے مانند ھے کہ جو شخص اس میں سوار ھوا اس نے نجات پائی اور جس نے اسے ترک کردیا وہ غرق ھوگیا. (174)

حدیث سفینہ، حدیث غدیر اور حدیث ثقلین کے بعد اسلام کی متواتر حدیثوں میں سے ھے اور محدثین کے درمیان عظیم شھرت رکھتی ھے.

کتاب عبقات الانوار (175) کے مولف علامہ میر حامد حسین مرحوم نے اس حدیث کو اھل

سنت کے نوے/90 مشھور علماء ومحدثین سے نقل کیا ھے.(176)

حدیث سفینہ کا مفاد

حدیث سفینہ جس میں پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عترت کو نوح کی کشتی سے تعبیر کیا گیا ھے.اس سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ اھل بیت (ع) کی پیروی نجات کا سبب اوران کی مخالفت نابودی کا سبب ھے۔

اب یہ دیکھنا چاھیئے کہ کیا صرف حلال وحرام میں ان کی پیروی کرنا چاھیئے اور سیاسی واجتماعی مسائل میں ان کے ارشاد وھدایت پر عمل کرنا واجب نھیں ھے یا یہ کہ تمام موارد میں ان کی پیروی واجب ھے اوران کے اقوال اورحکم کو بلا استثناء جان ودل سے قبول کرنا ضروری ھے؟

جولوگ کھتے ھیں کہ اھل بیت (ع) پیغمبر (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی صرف دین کے احکام اورحلال وحرام سے مربوط ھے وہ کسی دلیل کے بغیر پیروی کے موضوع کو محدود کرتے ھیں اوراس کی وسعت کو سمجھنے کی کوشش نھیں کرتے جب کہ حدیث میں اس طرح کی کوئی قید وشرط نھیں ھے۔

لھذا حدیث سفینہ بھی اس سلسلہ میں وارد ھونے والی دوسری احادیث کی طرح اسلامی قیادت وسرپرستی کے لئے اھل بیت (ع) کی لیاقت وشائستگی کو ثابت کرتی ھے۔

اس کے علاوہ مذکورہ حدیث اھل بیت (ع) کی عصمت وطھارت اوران کے گناہ ولغزش سے پاک ھونے کی بھترین گواہ ھے،کیونکہ ایک گناھگار وخطا کار بھلا کس طرح دوسروں کو

نجات اورگمراهوں کی هدایت کرسکتا هے؟!

حضرت امیر المومنین ں اوران کے جانشینوں کی ولایت اورامت اسلام کی پیشوائی ورهبری کے لئے ان کی لیاقت وشائستگی کے دلائل اس سے کهیں زیادہ هیں اوراس مختصرکتاب میں سمیٹے نهیں جاسکتے لهذا هم اتنے هی پر اکتفا کرتے هیں اور اپنی گفتگو کا آغاز عصمت کے موضوع سے کرتے هیں جوالٰهی رهبروں کے لئے بنیادی شرط هے۔

تیئیسویں فصل

ایک شخص کا معصوم هونا کیسے ممکن هے

کیا انسانی معاشرہ کی قیادت و رهبری سے بڑهکر کوئی منصب تصور کیا جا سکتا هے؟ کیا کوئی شخص روحی وجسمی امتیازات کے بغیر زندگی کے کسی ایک پهلو میں بهی معاشرہ کی قیادت کا بوجه سنبهال سکتا هے؟ چه جائیکه زندگی کے تمام مادی ومعنوی پهلوؤں میں!! جوصرف الٰهی رهبروں یعنی انبیاء وغیرہ سے مخصوص هے؟

سیاسی لیڈران جو ملک ومملکت کے صرف سیاسی مسائل میں قیادت کرتے هیں یا اقتصادی

مسائل کے ماھرین جوملک کی اقتصادکی باگڈورھاتہ میں رکھتے ھیں ان میدانوں سے متعلق خاص شرائط وصفات کے بغیر ----- جوانھیں دوسروں سے ممتاز و برتر ثابت کرتے ھیں ----- ملک کے اس اعلیٰ سیاسی یااقتصادی منصب کوحاصل ھی نھیں کرسکتے ۔

اگرایسا ھی ھے تو یہ بات بدرجہ اولی تسلیم کرنی چاھئے کہ انبیائے الٰھی اور ان کے حقیقی جانشینوں ----- جوانسانی معاشرہ کے تمام میدانوں میں رھبرھیں ----- میں بھی وہ عالی اور باعظمت صفات وکمالات ھونے چاھئےں جوان کی رھبری کی حیثیت کوثابت کریں ۔کیوں کہ درحقیقت ان صفات اورامتیازات کی بناپرھی ان افرادکو یہ عظیم منصب عطا کیا گیا ھے۔

آپ ان عظیم افراد کے امتیازات کوحسب ذیل دوعنوانوں میں خلاصہ کرسکتے ھیں:

1)۔گناہ اورخدا کی نافرمانی سے محفوظ رھنا۔

2)۔خدا سے احکام حاصل کرنے اورلوگوں کوان احکام کی تبلیغ کرنے میں خطا وغلطی سے محفوظ رھنا۔اس سے پھلے کہ الٰھی رھبروں کے لئےعصمت کے لازم ھونے کے دلائل بیان کئے جائیں،بھتر ھے کہ خودعصمت کے بارے میں اجمال کےساتھ یہ گفتگوکی جائے کہ کس طرح ایک شخص گناہ سے محفوظ رھتا ھے۔

عصمت کیا ھے؟

عصمت ایک نفسانی صفت اورایک باطنی طاقت ھے جواپنے حامل کوگناہ ھی سے نھیں بلکہ

گناہ انجام دینے کی فکر یا خیال سے بھی دور رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ خدا کا باطنی خوف ہے جو انسان کو گناہ سے حتیٰ گناہ کے ارادہ سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص تمام گناہوں سے محفوظ رہے اور وہ نہ صرف گناہ نہ کرے بلکہ گناہ اور نافرمانی کے ارادہ سے بھی دور رہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی برائیوں کے علم کا لازمہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہ سے محفوظ رکھے۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گناہ کی برائیوں کے سلسلہ میں ہر درجہ کا علم انسان کو گناہ سے محفوظ و معصوم بنا دیتا ہے، بلکہ علم کی حقیقت نمائی اس قدر قوی ہو جو گناہ کے برے آثار کو انسان کی نگاہ میں اس قدر مجسم کر دے کہ انسان ان برے کاموں کے انجام کو اپنی آنکھوں میں مجسم ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس صورت میں گناہ اس کے لئے "محال عادی" ہو جائے گا۔ ذہن کو اور قریب کرنے کے لئے حسب ذیل مطلب پر توجہ دیں۔

ہم میں سے ہر ایک شخص بعض ایسے اعمال سے جن سے ہماری جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے ایک طرح سے محفوظ و معصوم ہیں۔ اس طرح کا تحفظ اس علم کی پیداوار ہے جو ان اعمال کے نتائج کے طور پر ہمیں حاصل ہے مثال کے طور پر ایک دوسرے کے دشمن دو ملک جن کی سرحدیں آپس میں ملی ہوئی ہیں اور ہر طرف کے فوجی تھوڑے فاصلہ سے بلند برجوں پر قوی دوربینوں، تیز لائٹوں اور سدھے ہوئے کتوں کے ذریعہ سرحد کی نگرانی کر رہے ہیں اور خاص طور سے کسی کے سرحد پار کرنے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی سرحد سے ایک قسم بھی آگے بڑھا گولوں سے بھون دیا جائے گا ایسی صورت میں کوئی عقل مند انسان سرحد پار

کرنے کا خیال بھی اپنے ذھن میں نھیں لاسکتا چہ جائے کہ عملا بہ اقدام کرے ۔ایسا انسان اس عمل کے سلسلہ میں ایک طرح سے محفوظ و معصوم ھے۔

زیادہ دور نہ جائیں ،ھر عاقل انسان جسے اپنی زندگی سے پیار ھے،قاتل زھر کے مقابل جس کا کھانا اس کے لئے جان لیوا ھوگا یا بجلی کے ننگے تار کے مقابل جس کا لمس کرنا اسے جلا کر سیاہ کردے گا یا اس بیمار کی بچی ھوئی غذا کے مقابل -- جسے "جذام" یا "برص" کی شدید بیماری ھوئی ھو--جس کے کھانے سے اس کے اندر یہ مرض سرایت کرجائے گا،ایک طرح کا تحفظ اور عصمت رکھتا ھے۔یعنی وہ ھرگز اور کسی بھی قیمت پر یہ اعمال انجام نھیں دیتا اور اس سے ان اعمال کا ھونا ایک "محال عادی" ھے۔اس کا اس طرح سے محفوظ و معصوم رھنے کا سبب بھی ان اعمال کے برے نتائج کا اس کی نظر میں مجسم ھونا ھے۔عمل کے خطرناک آچار اس کی نظر میں اس قدر مجسم اور اس کے دل کی نگاہ میں اتنے نمایاں ھوجاتے ھیں کہ ان کی روشنی میں کوئی بھی انسان اپنے ذھن میں ان کاموں کے انجام دینے کا خیال تک نھیں لاتا، چہ جائے کہ وہ یہ عمل انجام دے ڈالے۔

ھم دیکھتے ھیں کہ ایک شخص یتیم و بےنوا کا مال ھضم کرجانے میں کوئی باک نھیں رکھتا جبکہ اس کے مقابل دوسرا شخص ایک پیسے حرام کھانے سے بھی پرھیز کرتا ھے۔پھلا شخص پوری بے باکی کے ساتھ ے تیموں کا مال کیوں کھاجاتا ھے لیکن دوسرا شخص حرام کے ایک پیسہ سے بھی کیوں پرھیز کرتا ھے؟

اس کا سبب یہ ھے کہ پھلا شخص سرے سے اس قسم کی نافرمانی کے برے انجام کا اعتقاد ھی

نہیں رکھتا اور اگر قیامت کا تھوڑا بھی ایمان رکھتا بھی ہے جب بھی تیزی سے تمام ہوجانے والی مادی لذتیں اس کے دل کی آنکھوں پر اس کے برے انجام کی طرف سے ایسا پردہ ڈال دیتی ہیں کہ ان کے برے آثار کا ایک ہلکا سا سایہ اس کی عقل کی نگاہوں کے سامنے سے گذر کر رہ جاتا ہے اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔لیکن دوسرا شخص اس گناہ کے برے انجام پر اتنا یقین رکھتا ہے کہ مال یتیم کا ہر ٹکڑا اس کی نظر میں جہنم کی آگ کے ٹکڑے کے برابر ہوتا ہے اور کوئی عقلمند انسان آگ کھانے کا اقدام نہیں کرتا، کیونکہ وہ علم وبصیرت کی نگاہ سے دیکھ لیتا ہے کہ یہ مال کس طرح جہنم کی آگ میں بدل جاتا ہے۔لھٰذا وہ اس عمل کے مقابل محفوظ ومعصوم رہتا ہے۔

اگر پہلے شخص کو بھی ایسا ہی علم اور ایسی ہی آگاہی حاصل ہوجائے تو وہ بھی دوسرے شخص کی طرح یتیم کا مال ظالمانہ طریقہ سے ہڑپ نہ کرے گا۔جو لوگ سونے اور چاندی کا ڈھیر اکٹھا کر لیتے ہیں اور خدا کی طرف سے واجب حقوق کو ادا نہیں کرتے قرآن مجید ان کے سلسلہ میں فرماتا ہے: یہی سونا چاندی قیامت کے دن آگ میں بدل جائے گا اور اس سے ان کی پیشانی پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا۔(177)

اب اگر ایسا خزانہ رکھنے والے اس منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور یہ دیکھ لیں کہ ان جیسے افراد کا کیا انجام ہوا،اس کے بعد انھیں تنبیہ کی جائے کہ اگر تم بھی اپنی دولت کو جمع کر کے رکھو گے اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرو گے تو تمھارا بھی یہی انجام ہوگا تو وہ بھی فوراً اپنی چھپائی ہوئی دولت کو نکال کر خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالیں گے۔

اکثر بعض افراد اسی دنیا میں الٰھی سزا وعذاب کے اس منظر کو دیکھے بغیر اس آیت کے مفھوم پر اس قدر ایمان رکھتے ھیں جو دیکھی ھوئی چیز پر ایمان سے کم نھیں ھوتا۔ یھاں تک کہ اگر دنیا وی و مادی پردے ان کی نگاھوں سے ھٹا دیئے جائیں جب بھی ان کے ایمان میں کوئی فرق نھیں آتا۔ ایسی صورت میں یہ شخص اس (خزانہ جمع کرنے کے) گناہ سے محفوظ رھتا ھے ،یعنی ھرگز سونا چاندی اکٹھا نھیں کرتا۔

اب اگر ایک شخص یا ایک گروہ کائنات کے حقائق کے سلسلہ میں کامل اور حقیقی آگاھی ومعرفت رکھنے کی وجہ سے تمام گناھوں کے انجام کے سلسلہ میں ایسی ھی حالت رکھتا ھواور گناھوں کی سزا ان پر اس قدر نمایاں اور واضح ھو کہ مادی حجاب نگاھوں سے اٹھنے یا زمان ومکان کے فاصلوں کے باوجود ان کے ایمان واعتقاد میں کوئی فرق نھیں آتا تو اس صورت میں یہ شخص یا وہ گروہ ان تمام گناھوں کے مقابل سوفی صدی تحفظ اور عصمت رکھتا ھے۔ نتیجہ میں ان سے نہ صرف گناہ سرزد نھیں ھوتے بلکہ انھیں گناہ کا خیال بھی نھیں آتا۔

لھذا یہ کھنا چاھئے کہ عصمت کسی ایک چیز یا تمام چیزوں میں اعمال کے انجام ونتائج کے قطعی علم اور شدید ایمان کے اثر سے پیدا ھوتی ھے؛ اور ھر انسان بعض امور کے سلسلہ میں ایک طرح کی عصمت رکھتا ھے مگر انبیائے الٰھی اعمال کے انجام سے مکمل آگاھی اور خدا کی عظمت کی کامل معرفت کی وجہ سے تمام گناھوں کے مقابل مکمل عصمت رکھتے ھیں اور اسی علم ویقین کی بنا پر گناہ کے تمام اسباب، خواھشوں اور شھوتوں پر قابو رکھتے ھیں اور ایک لمحہ کے لئے بھی خدا کے معین کردہ حدود سے سرکشی نھیں کرتے۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ھے کہ یہ صحیح ھے کہ انبیائے کرام گناہ اور ھر طرح کی نافرمانی سے محفوظ ھیں، لیکن اس تحفظ کا یہ مطلب نھیں ھے کہ وہ گناہ کے کام انجام دینے کی توانائی نھیں رکھتے اور خدا کا حکم بجالانے پر مجبور ھیں ۔ بلکہ یہ حضرات بھی تمام انسانوں کی طرح عمل کی آزادی اور اختیار رکھتے ھیں اور اطاعت یا نافرمانی دونوں پر انھیں قدرت حاصل ھے لیکن یہ لوگ اپنی باطنی آنکھوں سے -- جو کائنات کے حقائق سے متعلق ان کے وسیع علم کی وجہ سے انھیں حاصل ھوئی ھیں -- اعمال کے نتائج وانجام کا مشاھدہ کر لیتے ھیں اور ان نتائج سے جنھیں شریعت کی زبان میں عذاب کھا جاتا ھے، واقف و آگاہ رھتے ھیں، لھذا ھر طرح کے گناہ اور نافرمانی سے پرھیز کرتے ھیں ۔ اسے سمجھنے کے لئے حسب ذیل عبارت پر غور کیجئے:

اس میں کوئی شک نھیں ھے کہ خداوند عالم ھر طرح کے برے اور قبیح کام انجام دینے پر قادر ھے لیکن اس سے کبھی اس طرح کام صادر نھیں ھوتا جو اس کے عدل اور اس کی حکمت کے خلاف ھو اس کے باوجود ھم یہ نھیں کھہ سکتے کہ وہ ان کاموں کو انجام دینے کی قدرت نھیں رکھتا ۔ بلکہ وہ ھر شئے پر قادر ھے ۔ معصوم افراد بھی گناہ کے سلسلہ میں یھی کیفیت رکھتے ھیں وہ لوگ بھی گناہ کرنے کی قدرت و توانائی رکھنے کے باوجود معصیت و گناہ کی طرف نھیں جاتے ۔

چوبیسویں فصل

رهبران الهی کے لئے عصمت کی دلیلیں

علمائے عقائد نے الٰهی رهبروں خصوصاً انبیاء کرام کی عصمت کے بارے میں متعدد دلائل بیان کئے هیں هم یهاں ان میں سے دو دلیلیں بیان کرتے هیں۔

یه صحیح هے که ان علماء نے یه دلیلیں انبیاء کی عصمت کے لئے بیان کی هیں لیکن یهی دلیلیں جس طرح انبیاء کی عصمت کو ثابت کرتی هیں اسی طرح اماموں کی عصمت کو بھی ثابت کرتی هےں۔ کیونکه امامت شیعی نقطهٔ نظر سے رسالت اور نبوت کا هی تسلسل هے۔ فرق یه هے که انبیاء منصب نبوت رکھتے هیں اور ان کا رابطه وحی الٰهی سے هے اور امام کے یهاں یه دو صفتیں

نھیں ھے ں۔لیکن اگران دوخصوصیتوں سے صرف نظر کریں توانبیاءاوراماموں کے درمیان کوئی خاص فرق نظرنھیں آتا۔

اب یہ دونوں دلیلیں ملاحظہ ھوں:

1۔تربیت عمل کے سایہ میں:

اس میں کوئی شک نھیں کہ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد انسانوں کی تربیت اور ان کی راھنمائی ھے اورتربیت کے موٴثر اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ھے کہ مربی میں ایسے صفات پائے جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس سے قریب ھوجائے ں۔مثال کی طور پر اگرکوئی مربی خوش گفتار،فصیح اور نپی تلی بات کرنے والا ھولیکن بعض ایسے نفرت انگیز صفات اس میں پائے جائیں جس کے سبب لوگ اس سے دور ھوجائے ں تو ایسی صورت میں انبیاء کی بعثت کا مقصدھی پورانھیں ھوگا۔

ایک مربی ورھبر سے لوگوں کی دوری اورنفرت کا سب سے بڑا سبب یہ ھے کہ اس کے قول وفعل میں تضاداوردورنگی پائی جاتی ھو۔اس صورت میں نہ صرف اس کی راھنمائیاں بے قدر اوربیکارھوجائے ں گی بلکہ اس کی نبوت کی اساس وبنیادھی متزلزل ھوجائے گی۔

شیعوں کے مشھوراور بزرگ عالم سیدمرتضی علم الھدیٰ نے اس دلیل کو یوں بیان کیا ھے:اگر ھم کسی کے فعل کے بارہ میں اطمینان نھیں رکھتے یعنی اگرھمیں یہ شبہ ھے کہ وہ کوئی گناہ انجام دیتاھے توھم اطمینان قلب کے ساتھ اس کی بات پر دھیان نھیں دیتے۔اورایسے شخص کی

باتوں پر اثر نھیں کرسکتیں جس کے بارے میں ھم جانتے ھیں کہ وہ خود اپنی بات پر عمل نھیں کرتا۔ جس طرح مربی یا رھبر کا گناہ کرنا لوگوں کی نظر میں اسے کم عقل، بے حیا اور لا ابالی ثابت کرتا ھے اور لوگوں کو اس سے دور کردیتا ھے اسی طرح مربی یا رھبر کے قول و فعل کی دو رنگی بھی لوگوں پر اس کے خلاف منفی اثر ڈالتی ھے۔

اگر کوئی ڈاکٹر شراب کے نقصانات پر کتاب لکھے یا کوئی متأثر کرنے والی فلم دکھائے لیکن خود لوگوں کے مجمع میں اس قدر شراب پیئے کہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ھوسکے۔ ایسی صورت میں شراب کے خلاف اس کی تمام تحریریں، تقریریں اور زحمتیں خاک میں مل جائیں گی۔

فرض کیجئے کہ کسی گروہ کا رھبر کرسی پر بیٹھ کر عدل وانصاف اور مساوات کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے زبردست تقریر کرے لیکن خود عملی طور سے لوگوں کا مال ھڑپ کرتا رھے تو اس کا عمل اس کی کھی ھوئی باتوں کو بے اثر بنادے گا۔

خداوند عالم اسی وجہ سے انبیاء کو ایسا علم وایمان اور صبر وحوصلہ عطا کرتا ھے تاکہ وہ تمام گناھوں سے خود کو محفوظ رکھیں۔

اس بیان کی روشنی میں انبیائے الٰھی کے لئے ضروری ھے کہ وہ بعثت کے بعد یا بعثت سے پھلے اپنی پوری زندگی میں گناھوں اور غلطیوں سے دور رھیں اور ان کا دامن کسی بھی طرح کی قول وفعل کی کمزوری سے پاک اور نیک صفات سے درخشاں رھنا چاھئے۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے اپنی عمر کا تھوڑا سا حصہ بھی لوگوں کے درمیان گناہ اور معصیت کے ساتھ گزارا ھو اور اس کی زندگی کا نامۂ اعمال سیاہ اور کمزوریوں سے بھرا ھو تو ایسا شخص بعد میں لوگوں کے دلوں میں

گھر نھیں کر سکتا اور لوگوں کو اپنے اقوال و کردار سے متاثر نھیں کر سکتا۔

خداوند عالم کی حکمت کا تقاضا ھے کہ وہ اپنے نبی و رسول میں ایسے اسباب وصفات پیدا کرے کہ وہ ھر دل عزیز بن جائے ں۔اور ایسے اسباب سے انھیں دور رکھے جن سے لوگوں کے نبی یا رسول سے دور ھونے کا خدشہ ھو۔ظاھر ھے کہ انسان کے گزشتہ برے اعمال اور اس کا تاریک ماضی لوگوں میں اس کے نفوذ اور اس کی ھر دلعزیزی کو انتھائی کم کر دے گا اور لوگ یہ کھیں گے کہ کل تک تو وہ خود بدعمل تھا،آج ھمیں ھدایت کرنے چلا ھے؟!

2۔اعتماد جذب کرنا:

تعلیم وتربیت کے شرائط میں سے ایک شرط،جو انبیاء یا الٰھی رھبروں کے اھم مقاصد میں سے ھے،یہ ھے کہ انسان اپنے مربی کی بات کی سچائی پر ایمان رکھتا ھو کیونکہ کسی چیز کی طرف ایک انسان کی کشش اسی قدر ھوتی ھے جس قدر وہ اس چیز پر اعتماد و ایمان رکھتا ھے۔ایک اقتصادی یا صحی پروگرام کا پر جوش استقبال عوام اسی وقت کرتے ھیں جب کوئی اعلیٰ علمی کمیٹی اس کی تائید کر دیتی ھے۔کیونکہ بھت سے ماھروں کے اجتماعی نظریہ میں خطا یا غلطی کا امکان بھت کم پایا جاتا ھے۔اب اگر مذھبی پیشواؤں کے بارے میں یہ امکان ھو کہ وہ گناہ کرتے ھوں گے تو قطعی طور سے جھوٹ یا حقائق کی تحریف کا امکان بھی پایا جاتا ھوگا۔اس امکان کی وجہ سے ان کی باتوں سے ھمارا اطمینان اٹھ جائے گا۔اسی طرح انبیاء کا مقصد جو انسانوں کی تربیت اور

هدایت هے هاته نه آئے گا۔

ممکن هے یه کها جائے که اعتماد واطمینان حاصل کرنے کے لئے یه کافی هے که دینی پیشوا جھوٹ نه بولیں اوراس گناه کے قریب نه جائےں تا که انهیں لوگوں کا اعتماد حاصل هو۔ بقیه سارے گناهوں سے ان کا پرهیز کرنا لازم نهیں هے کیونکه دوسرے گناهوں کے کرنے یا نه کرنے سے مسئله اعتماد واطمینان پر کوئی اثر نهیں پڑتا۔

جواب یه هے که اس بات کی حقیقت ظاهر هے، کیونکه یه کیسے ممکن هے که ایک شخص جھوٹ بولنے پر آماده نه هولیکن دوسرے گناهوں مثلاً آدم کشی، خیانت اور بےعفتی و بےحیائی کے اعمال کرنے میں اسے کوئی باک نه هو؟ اصولاً جو شخص دنیا کی لمحاتی لذتوں کے حصول کے لئے هر طرح کے گناه انجام دینے پر آماده هو وه ان کے حصول کے لئے جھوٹ کیسے نهیں بول سکتا۔؟!(178)

اصولی طور سے انسان کو گناه سے روکنے والی طاقت ایک باطنی قوت یعنی خوف خدااور نفس پر قابو پانا هے۔ جس کے ذریعه انسان گناهوں سے دور رهتا هے۔ پھر یه کیسے ممکن هے که جھوٹ کے سلسله میں تو یه قوت کام کرے لیکن دوسرے گناهوں کے سلسله میں جو عموماً بهت برے اور وجدان وضمیر کی نظر میں جھوٹ سے بھی زیاده قبیح هوں، یه قوت کام نه کرے؟!

اور اگر هم اس جدائی کو ثبوت کے طور پر قبول کربھی لیں تو اثبات کے طور سے یعنی عملاً عوام اسے قبول نهیں کرےں گے۔ کیونکه لوگ اس طرح کی جدائی کو هرگز تسلیم نهیں کرتے۔

اس کے علاوه گناه جس طرح گناه گار کو لوگوں کی نظر میں قابل نفرت بنا دیتے هیں اسی طرح

لوگ اس کی باتوں پر بھی اعتماد واطمینان نھیں رکھتے اور" انظر الیٰ ما قال ولاتنظر من الیٰ قال" یعنی یہ دکھو کیا کھہ رھا ھے یہ نہ دیکھو کون کھہ رھا ھے کا فلسفہ فقط ان لوگوں کے لئے موٴثر ھے جو شخصیت اوراس کی بات کے درمیان فرق کرنا چاھتے ھیں لیکن ان لوگوں کے لئے جو بات کی قدر قیمت کو کھنے والے کی شخصیت اور اس کی طھارت وتقدس کے آئینہ میں دیکھتے ھیں یہ فلسفہ کارگر نھیں ھوتا۔

یہ بیان جس طرح رھبری وقیادت کے منصب پر آنے کے بعد صاحب منصب کے لئے عصمت کوضروری جانتا ھے،اسی طرح صاحب منصب ھونے سے پھلےاس کے لئےعصمت کولازم وضروری سمجھتا ھے۔کیونکہ جو شخص ایک عرصہ تک گناہ گار ولاابالی رھاھواوراس نے ایک عمر جرائم وخیانت اورفحشا وفساد میں گزاری ھو، چاھے وہ بعد میں توبہ بھی کرلے،اس کی روح میں روحی ومعنوی انقلاب بھی پیدا ھوجائے اور وہ متقی و پرھیز گاراور نیک انسان بھی ھوجائے لیکن چونکہ لوگوں کے ذھنوں میں اس کے برے اعمال کی یادیں محفوظ ھیں لھذا لوگ اس کی نیکی کی طرف دعوت کوبھی بدبینی کی نگاہ سے دیکھیں گےاور بسا اوقات یہ تصور بھی کرسکتے ھیں کہ یہ سب اس کی ریا کاریاں ھیں وہ اس راہ سے لوگوں کوفریب دینا اور شکار کرنا چاھتا ھے۔اور یہ ذھنی کیفیت خاص طور سے تعبدی مسائل میں جھاں عقلی استدلال اور تجزیہ کی گنجائش نھیں ھوتی،زیادہ شدت سے ظاھر ھوتی ھے۔

مختصر یہ کہ شریعت کے تمام اصول وفروع کی بنیاد استدلال وتجربہ پرنھیں ھوتی کہ الٰھی رھبر ایک فلسفی یا ایک معلم کی طرح سے اس راہ کواختیار کرے اوراپنی بات استدلال کے ذریعہ

ثابت کرے، بلکہ شریعت کی بنیاد وحی الٰھی اور ایسی تعلیمات پر ھے کہ انسان صدیوں کے بعد اس کے اسرار وعلل سے آگاہ ھوتا ھے اور اس طرح کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لئے شرط یہ ھے کہ لوگ الٰھی رھبر کے اوپر سو فی صدی اعتماد کرتے ھوں کہ جو کچھ وہ سن رھے ھیں اسے وحی الٰھی اور عین حقیقت تصور کریں، اور ظاھر ھے کہ یہ حالت ایسے رھبر کے سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں ھرگز پیدا نھیں ھوسکتی جس کی زندگی ابتدا سے انتھا تک روشن و درخشاں اور پاک و پاکیزہ نہ ھو۔(179)

یہ دو دلیلیں نہ صرف انبیائے کرام کے لئے عصمت کی ضرورت کو ثابت کرتی ھیں، بلکہ یہ بھی ثابت کرتی ھیں کہ انبیاء کے جانشینوں کو بھی انبیاء کی طرح معصوم ھونا چاھئے، کیوں کہ امامت کا منصب اھل سنت کے نظریہ کے برخلاف کوئی حکومتی اور معمولی منصب نھیں ھے بلکہ جیسا کہ ھم پچھلے بیان کرچکے ھیں امامت کا منصب ایک الٰھی منصب ھے اور امام پیغمبر کے ساتھ (نبوت اور وحی کے علاوہ) تمام منصبوں میں شریک ھے۔ امام، دین کا محافظ و نگھبان اور قرآن کے مجمل مطالب کی تشریح کرنے والا ھے نیز ایسے بھت سے احکام کو بیان کرنے والا ھے جنھیں پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیان کرنے میں کامیاب نھیں ھوئے تھے۔

اس لئے امام مسلمانوں کا حاکم اور ان کی جان و مال و ناموس کا نگھبان بھی ھے اور شریعت کو بیان کرنے والا اور الٰھی معلم و مربی بھی ھے اور ایک مربی کو معصوم ھونا چاھئے، کیوں کہ اگر اس سے کوئی بھی چھوٹا یا بڑا گناہ سرزد ھوا تو اس کی تربیت بے اثر ھوجائے گی۔ اور اس کی گفتار

وکردار کی صحت ودرستگی پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

پچیسویں فصل

جن کے رتبے ھیں سوا ان کو سوا...... یہ طے ھے کہ اھم اور بڑی ذمہ داریوں کی انجام دھی کے لئے حالات وشرائط بھی سنگین ھوتے ھیں۔ذمہ داری جتنی بڑی اور جتنی سنگین ھوتی ھے ،شرائط بھی اسی لحاظ سے سنگین اور سخت ھوتے ھیں۔ایک امام جماعت کے شرائط عدالت کے اس قاضی کے برابر نھیں ھیں جس کے اختیار میں لوگوں کی جان ومال ھوتے ھیں۔

نبوت اور امامت عظیم ترین منصب ھے جو خدا کی طرف سے انسانوں کو عطا ھوا ھے، جو افراد اس منصب پر فائز ھوتے ھیں وہ خداوند عالم کی طرف سے لوگوں کی جان ومال وناموس پر مکمل تسلط واختیار رکھتے ھیں اور ان کا ارادہ لوگوں کی زندگی کے تمام پھلوؤں پر نافذ ھوتا

هے۔قرآن مجید پیغمبر اکرم کے بارے میں فرماتا هے :" النبی اولیٰ بالمونین من انفسهم "
(180)یعنی پیغمبر باایمان لوگوں کی جانوں پران سے زیادہ حق رکھتا هے۔
پیغمبراسلام (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حدیث غدیر کے خطبہ میں خودکواور حضرت علی علیہ السلام کولوگوں کی جانوں پران سے زیادہ اولیٰ اور صاحب اختیار بتایا۔کیا یہ ممکن هے کہ حکمت وتدبیر ولا خدا ایسے عظیم اوراهم منصب کی باگڈور ایک غیر معصوم شخص کے هاتہ میں دے دے
"اللہ اعلم حیث یجعل رسالته"

قرآن کی راهنمائی

پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم)اور صاحبان امر (اولی الامر) (181) قرآن کے صاف حکم کے مطابق واجب الاطاعت هیں اور جس طرح هم خدا کے فرمان کی اطاعت کرتے هیں یوں هی ان کے حکم کی اطاعت بھی هم پر واجب هے چنانچہ ارشاد هوتا هے :" اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" یعنی خدا کی اطاعت کرو،اس کے رسول کی اور صاحبان امر کی اطاعت کرو۔(182)
یہ آیت بالکل واضح طور سے صاحبان امر کی بلاقید وشرط اطاعت کاحکم دیتی هے۔اگر یہ افراد سوفی صدی گناہ وخطا سے محفوظ هوں گے جب هی خداوندعالم کی طرف سے ان کی بلاقید وشرط اطاعت کا واجب کیا جانا صحیح هوگا۔کیوں کہ اگرهم ان کی عصمت کوتسلیم کرلیں تومعصوم کی بے

قید وشرط اطاعت پر کوئی اعتراض نہ ھوگا،لیکن اگر ھم یہ فرض کرلیں کہ(اولی الامر) یعنی صاحبان امر کا گروہ جن کی اطاعت ھم پر واجب کی گئی ھے۔معصوم نہ ھوں بلکہ گناہ گار وخطا کارافرادھوں تو ایسی صورت میں خداوندعالم یہ کیسے حکم دے گا کہ ھم ان لوگوں کی بلاقید وشرط پیروی کریں؟!

لھذا اگرھم پیغمبراکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشینوں کے لئےعصمت کوشرط نہ جانیں اورفرض کریں کہ کسی جانشین نے کسی مظلوم کے قتل یا کسی بے گناہ کا مال و جائداد ضبط کئے جانے کا حکم دے دیا اورھم جانتے ھوں کہ وہ شخص مظلوم یا بے گناہ تھا تو ایسی صورت میں ھمیں قرآن کے حکم کے مطابق اس جانشین کےفرمان پر موبموعمل کرنا ھوگا یعنی اس مظلوم کو قتل یا بے گناہ کا مال ضبط کرنا ھوگا۔

لیکن اگرھم یہ کھیں کہ قرآن کریم نے"اولی الامر" کی پیروی کوخدااوررسول کی اطاعت کے ساتھ قرار دیا ھےاوران تینوں اطاعتوں کو بلاقید وشرط شمار کیا ھےتو اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ھے کہ"اولی الامر"رسول خدا(صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ھی طرح گناہ وخطا سے معصوم ھیں۔لھذا اب ھم یہ کھیں گے کہ کبھی کوئی معصوم"اولی الامر"کسی مظلوم کے قتل یا کسی بے گناہ کا مال ضبط کرنے کا حکم نھیں دیتا۔

ایک سوال کا جواب:

ممکن ھے یہ کھا جائے کہ اولی الامر کی اطاعت اسی صورت میں واجب ھے جب وہ شریعت

اور خدا اور سول کے صاف حکم کے مطابق عمل کرے۔ ورنہ دوسری صورت میں نہ صرف ان کی اطاعت واجب نھیں ھے بلکہ ان کی مخالفت کرنی چاھئے۔

اس سوال کا جواب واضح ھے۔ کیوں کہ یہ بات اسی وقت عملی ھے جب اول یہ کہ تمام لوگ الٰھی احکام اور فروع دین سے مکمل آگاھی رکھتے ھوں اور حرام وحلال کی تشخیص دے سکتے ھوں۔ دوسرے یہ کہ اس قدر جرأت وشجاعت رکھتے ھوں کہ حاکم کے قھر وغضب سے خوف زدہ نہ ھوں جب ھی یہ ممکن ھے کہ وہ حاکم کا حکم شریعت سے مطابق ھونے کی صورت میں بجالائیں ورنہ دوسری صورت میں اس سے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ھوں۔ لیکن افسوس کہ عام طور سے لوگ الٰھی احکام سے پوری آگاھی نھیں رکھتے کہ "اولی الامر" کے فرمان کو تشخیص دے سکیں بلکہ لوگوں کی اکثریت اس بات کی توقع رکھتی ھے کہ " اولی الامر" کے ذریعہ الٰھی احکام سے آگاہ ھوں اسی طرح جو طاقت سب پر مسلط ھے اس کی مخالفت بھی کوئی آسان بات نھیں ھے اور ھر ایک اس کے انجام کو برداشت نھیں کرسکتا۔

اس کے علاوہ اگر قوم کو ایسے اختیارات حاصل ھوجائیں تو لوگوں کے دلوں میں سرکشی کا جذبہ پیدا ھوگا اور نظام درھم و برھم ھوجائے گا اور ھر شخص کسی نہ کسی بھانہ سے " اولی الامر" کی اطاعت سے انکار کرے گا اور قیادت کی مشینری میں خلل پیدا ھوجائے گا،

یھی وجہ ھے کہ اس آیت کریمہ کی روشنی میں یہ یقین کیا جاسکتا ھے کہ "اولی الامر" کا منصب ان لوگوں کے لئے ھے جن کی اطاعت بلا قید وشرط واجب کی گئی ھے اور یہ افراد معصوم شخصیتوں کے علاوہ کوئی اور نھیں ھیں جن کا دامن ھر طرح کے گناہ، خطا، یا لغزش سے پاک

ھے۔

قرآن کی دوسری راھنمائی

قرآن کریم میں ایک دوسری آیت جو امامت سے متعلق گفتگو کرتی ھے پوری بلاغت کے ساتھ ظلم وستم سے پرھیز کو امامت کے لئے شرط قرار دیتی ھے۔ چنانچہ ارشاد ھوتا ھے:

"اذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلك للناس اماماً قال و من ذریتی قال لا ینال عھدی الظالمین"

"یعنی جب ابراھیم (ع) کو ان کے پروردگار نے بعض امور کے لئے آزمایا اور وہ تمام امتحانوں میں کامیاب ھوئے تو ان سے ارشاد ھوا کہ میں نے تم کو لوگوں کا پیشوا وامام قرار دیا ۔(جناب ابراھیم (ع) نے) عرض کیا: میری ذریت اور میری اولاد کو بھی یہ منصب نصیب ھوگا تو جواب ملا کہ میرا عھد ستم گاروں تک نھیں پھنچے گا"(183)

امامت،نبوت کے مانند الٰھی منصب ھے جو صرف صالح اور شائستہ افراد کو ھی ملتا ھے اس آیت میں جناب ابراھیم (ع) نے خدا سے یہ تقاضا کیا کہ میری اولاد کے حصہ میں بھی یہ منصب آئے لیکن فوراً خداوند عالم کا خطاب ھوا کہ ظالم وستمگر افراد تک یہ منصب نھیں پھنچے گا۔ مسلّم طور سے اس آیت میں ظالم سے مراد وہ افراد ھیں جو گناھوں سے آلودہ ھیں، کیوں کہ ھر طرح کا گناہ اپنے آپ پر ایک ظلم اور خدا کی بارگاہ میں نافرمانی کی جسارت ھے۔ اب یہ دیکھنا چاھئے کہ کون سے ظالم لوگ اس آیت کے حکم کے مطابق منصب قیادت وامامت سے

محروم ہیں۔ اصولی طور سے جو شخصیتیں لوگوں کی پیشوائی اور حاکمیت کی باگڈور سنبھالتی ہیں وہ چار ہی طرح کی ہوتی ہیں:

1۔ یا وہ زندگی بھر ظالم رہے ہیں چاہے منصب حاصل کرنے سے پہلے یا اس کے بعد۔

2۔ یا انھوں نے پوری عمر میں کبھی گناہ نہیں کیا۔

3۔ حاکم ہونے سے پہلے ظالم وستمگر تھے لیکن قیادت وپیشوائی حاصل کرنے کے بعد پاک صاف ہو گئے۔

4۔ یہ تیسری قسم کے برعکس ہے یعنی حکومت ملتے ہی ظلم وستم شروع کر دیا اس سے پہلے گناہ نہیں کرتے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب ابراہیم (ع) نے ان چار گروہوں میں سے کس کے لئے اس منصب کی آرزو کی تھی؟ یہ تو ہرگز سوچا نہیں جاسکتا کہ جناب ابراہیم (ع) نے پہلے اور جو تھے گروہ کے لئے اس عظیم منصب کی آرزو کی ہوگی۔ کیونکہ جو لوگ حاکمیت کے دوران ظالم وستمگر میں کسی بھی صاحب عقل اور صائب رائے رکھنے والے کی نظر میں اس منصب کے لائق نہیں ہوتے ہیں، چہ جائیکہ ابراہیم (ع) خلیل کی نگاہ میں۔ جنھوں نے خود کتنے سنگین امتحانات دینے، ساری زندگی پاکیزگی کے ساتھ بسر کرنے اور گناہ وظلم سے مسلسل لڑنے کے بعد یہ عظیم منصب حاصل کیا ہے وہ ہرگز مذکورہ دو گروہوں کے لئے تمام انسانوں پر امامت کی آرزو نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ جناب ابراہیم (ع) کا مقصود دوسری دو قسم کی شخصیتیں تھیں۔ اس صورت میں جملہ "لاینال" کی شرط کے ذریعہ تیسرا گروہ بھی نکل جاتا ہے اور منصب

امامت کے لئے صرف وھی گروہ رہ جاتا ھے جس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی گناہ نھیں کیا ھے۔

چھبیسویں فصل

کون سی تعبیر صحیح ھے "عترتی" یا "سنتی"

اگر چہ کتاب اپنے اختتام کو پھنچ چکی تھی لیکن یھاں دو موضوع پر گفتگو لازمی وضروری ھے۔

1۔حدیث ثقلین سے متعلق گفتگو ھوتی ھے تو بعض اھل سنت لفظ "عترتی" کی جگہ "سنتی" استعمال کرتے ھیں اور "کتاب اللہ وسنتی" کھتے ھیں۔

2۔اھل سنت حضرات پیغمبر اکرم پر درود بھیجتے وقت ان کی آل کو شامل نھیں کرتے۔

یہ دو موضوع شیعہ اور اھل سنت دونوں گروھوں کے درمیان اختلاف کا سبب ھیں لھذا یھاں ان دونوں موضوعات کا جائزہ لیا جارھا ھے۔

1۔کون سی تعبیر صحیح ھے:

امامیہ متکلمین جیسے صدوق،طوسی اور مفید رضوان اللہ علیھم نے بھت سے کلامی مسائل میں پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عترت واھل بیت (ع) کی احادیث سے استدلال کیا ھے اور اس سلسلہ میں حدیث ثقلین کا سھارا لیتے ھیں جب کہ بعض محدثوں نے مذکورہ حدیث کو دوسری شکل میں نقل کیا ھے اور لفظ" عترتی " کے بجائے"سنتی" لائے ھیں۔حدیث ثقلین کے متن میں اس اختلاف کے ھوتے ھوئے اس کے ذریعہ کلامی مسائل میں استدلال کیسے کیا جاسکتا ھے؟

وضاحت: امامیہ شیعہ جو اصول وعقائد میں برھان وعقلی دلیل کی پیروی کرتے ھیں،اھل بیت (ع) کے اقوال واحادیث کو بھی اگر صحیح نقل ھوئی ھوں تو اصول وفروع میں حجت جانتے ھیں۔فرق یہ ھے کہ فروعی وعملی مسائل میں خبر صحیح کو مطلق طور سے حجت جانتے ھیں چاھے وہ خبر واحد کی صورت میں کیوں نہ ھو لیکن اصول وعقائد سے مربوط مسائل میں چونکہ مقصد اعتقاد ویقین پیدا کرنا ھے اور خبر واحد یقین کی حد تک نھیں پھنچاتی لھذا صرف اس قطعی خبر کو جس سے یقین وعلم حاصل ھوتا ھو حجت شمار کرتے ھیں۔اھل بیت (ع) کے اقوال کی حجیت کی ایک دلیل حدیث ثقلین ھے جسے بھت سے اسلامی محدثوں نے قبول کیا ھے اور وہ کھتے ھیں کہ پیغمبر اکرم نے ارشاد فرمایا ھے:

"انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ وعترتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا"

لیکن چونکہ بعض روایات میں" عترتی " کے بجائے"سنتی" آیا ھے،اسی لئے یہ سوال پیدا ھوتا

ھے کہ ان دو روایتوں میں سے کون صحیح ودرست ھے ؟اس لئے کلامی مسائل میں اھل بیت (ع) کی احادیث کے ذریعہ استدلال پر سوالیہ نشان لگ گیا ھے؟ جس کے جواب میں علمائے شیعہ کی طرف سے رسالے اور کتابیں لکھی گئی ھیں جن میں سب سے اھم کتاب" دار التقریب بین المذاھب الاسلامیۃ" کی جانب سے قاھرہ مصر میں شائع ھوچکی ھے۔

ابھی کچھ عرصہ پھلے اردن کے ایک اھل سنت عالم" شیخ حسن بن علی سقاف" نے اس سوال کا جواب دیا ھے، ھم قارئین کرام کی خدمت میں اس کا ترجمہ پیش کرتے ھیں اور چونکہ ان کا جواب سو فیصدی تحقیقی ھے لھذا اسی پر اکتفا کرتے ھیں آخر میں ایک یاددھانی شیخ سقاف کی خدمت میں بھی کریں گے۔

سوال:

مجھ سے حدیث ثقلین کے بارے میں سوال کیا گیا اور دریافت کیا گیا ھے کہ" عترتی واھل بیتی" صحیح ھے یا" کتاب اللہ وسنتی" آپ سے درخواست ھے کہ سند کے اعتبار سے اس حدیث کی وضاحت فرمایئے۔

جواب:

اس متن کو دو بڑے محدثوں نے نقل کیا ھے:

1۔ مسلم نے اپنی صحیح میں جناب زید بن ارقم سے نقل کیا ھے۔ وہ کھتے ھیں کہ پیغمبر اسلام نے

ایک روز مکہ اور مدینہ کے درمیان "خُم" نام کی جگہ پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں خدا کی حمد وثنا اور لوگوں کو نصیحت فرمائی۔اس کے بعد فرمایا:

"یا ایها الناس!فانما انا بشر یوشك ان یاتی رسول ربی فاجیب وانا تارك فیکم ثقلین :اولهما کتاب الله فیه الهدیٰ والنور ،فخذوا بکتاب الله واستمسکوا به فحثّ علیٰ کتاب الله ورغّب فیه ثم قال واهل بیتی،اذ کّرکم الله فی اهل بیتی،اذ کّرکم الله فی اهل بیتی،اذ کّرکم الله فی اهل بیتی"

اے لوگو! میں انسان هوں ممکن هے کہ عنقریب خدا کا فرستادہ میرے پاس آئے اور میں اس کی دعوت پر لبیک کهوں ۔میں تمهارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رها هوں ۔ایک اللہ کی کتاب هے،جس میں هدایت ونور هے۔پس اللہ کی کتاب کو حاصل کرو اور اس سے تمسک اختیار کرو،

پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کی کتاب پر عمل کرنے کی تاکید کی اس کے بعد فرمایا: اور میرے اهل بیت (ع)، میں تمهیں اپنے اهلبیت (ع) کے لئے خدا کی یاد دلاتا هوں (یہ جملہ آپ نے تین بار فرمایا)

اس متن کو مسلم (185) نے اپنی صحیح میں اور دارمی نے اپنی سنن (186) میں ذکر کیا هے اور دونوں کی سند آفتاب کی طرح روشن هے ان سند میں ذرہ برابر بھی خدشہ نهیں هے۔

2۔ترمزی نے بھی اس متن کو" عترتی اهل بیتی" کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا هے۔حدیث کا متن یوں هے:

" انّی تارك فیکم ما ان تمسکتم به لن تضلوا بعدی ، احدهما اعظم من

الاخر کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الیٰ الارض و عترتی اھل بیتی لن یفترقا حتٰی یردا علیّ الحوض،فانظروا کیف تخلفونی فیھا" (187)

"میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارھاھوں، جب تک تم اس سے متمسک رھو گے ھرگز گمراہ نھیں ھوگے ان میں سے ایک دوسرے سے بزرگ ھے۔اللہ کی کتاب ریسمان رحمت جو آسمان سے زمین کی طرف آویزاں ھے۔اور میری عترت واھل بیت (ع)۔یہ دونوں ایک دوسرے سے ھرگز جدانھیں ھوں گے یھاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس آجائیں۔اب دیکھو میری ان دونوں میراثوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ھو۔

یہ دونوں متن کہ دونوں میں لفظ"اھل بیت" کی تاکید ملتی ھے اس سلسلہ میں جواب کے طور پر کافی ھیں دونوں کی سندوں میں کمال یقین پایا جاتا ھے اوراس میں کسی بحث کی ضرورت نھیں ھے۔دونوں حدیثی متن کے ناقل صحاح وسنن ھیں جوایک خاص اعتبار رکھتے ھیں۔

"وسنتی" کے متن کی سند

وہ روایت جس میں"اھل بیتی" کے بجائے لفظ"سنتی" آیا ھے۔جعلی حدیث ھے جو سند کے ضعف کے علاوہ امویوں سے وابستہ افراد کے ھوتھوں گڑھی ھوئی ھے۔ ذیل میں ھم اس حدیث کی اسناد کا جائزہ لیتے ھیں:

پھلی سند ،حاکم کی روایت:

حاکم نیشاپوری نے اپنی "مستدرک" میں حسب ذیل سند کے ساتھ نقل کیا ھے۔:

1۔اسماعیل بن ابی اویس

2۔ابی اویس

3۔ثور بن زید الدیلمی

4۔عکرمہ

5۔ابن عباس کہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔:

"یاایھا الناس انی قدترکت فیکم ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابدا کتاب اللہ وسنة نبیہ" (188)

اے لوگو! میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں ترک کیں جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رھوگے ھرگز گمراہ نہ ھوگے۔اللہ کی کتاب اوراس کے نبی کی سنت۔

اس متن کی سند کی مشکل اسماعیل بن ابی اویس اور ابو اویس ھیں۔ان باپ اور بیٹوں کی نہ صرف توثیق نھیں ھوئی ھے بلکہ ان پر جھوٹ اور حدیث گڑھنے کا الزام ھے۔اب ان کے بارے میں علمائے رجال کی آراء ملاحظہ فرمائیں:

حافظ مزی نے اپنی کتاب "تھذیب الکمال" میں اسماعیل اوراس کے باپ کے بارے میں رجال کے محققین کی زبانی یوں نقل کیا ھے:

یحییٰ بن معین (جو علم رجال کے بڑے عالم ھیں) کھتے ھیں۔ابو اویس اوراس کا بیٹا ضعیف ھیں،یحییٰ بن معین سے یہ بھی نقل ھے کہ یہ دونوں حدیث چراتے ھیں۔ابن معین نے اس کے بارے میں یہ بھی کھا ھے کہ:اس کی بات پر اعتماد نھیں کیا جا سکتا۔

نسائی نے بیٹے کے بارے میں کھا ھے کہ: وہ ضعیف ھے اور ثقہ نھیں ھے۔ ابوالقاسم لا لکائی نے کھا ھے کہ نسائی نے اس کے خلاف بھت کچھ کھا ھے۔ یھاں تک کہ اس نے کھا ھے: اس کی حدیث کو ترک کر دینا چاھئے۔

رجال کے ایک عالم ابن عدی نے کھا ھے: ابن ابی اویس نے اپنے ماموں مالک سے مجھول حدیثیں نقل کی ھیں جنھیں کوئی قبول نھیں کرتا۔(189)

ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں لکھا ھے: ابن ابی اویس کی حدیث کے ذریعہ ھرگز استدلال نھیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ نسائی نے اس کی مذمت کی ھے۔(190)

حافظ سید احمد بن الصدیق نے کتاب "فتح الملک العلیّ" میں سلمہ بن شبیب سے نقل کیا ھے کہ اس نے اسماعیل بن ابی اویس کو کھتے ھوئے سنا ھے: جب اھل مدینہ کسی موضوع کے بارے میں دو گروھوں میں تقسیم ھوجاتے ھیں تو میں حدیث گڑھتا ھوں۔(191)

لھذا بیٹا (اسماعیل بن ابی اویس) وہ ھے جس پر حدیث گڑھنے کا الزام ھے اور ابن معین اسے جھوٹا کھتے ھیں مزید یہ کہ اس کی حدیث کسی بھی کتب صحاح میں نقل نھیں ھوئی ھے۔

اور باپ کے بارے میں یھی کھنا کافی ھے کہ ابوحاتم رازی نے کتاب "جرح وتعدیل" میں لکھا ھے: اس کی حدیث لکھی جاتی ھے لیکن اس کے ذریعہ احتجاج واستدلال نھیں کیا جاتا۔ اور اس کی حدیث قوی ومحکم نھیں ھے۔(192)

نیز ابوحاتم نے ابن معین سے نقل کیا ھے کہ ابواویس قابل اعتماد نھیں ھے۔

جو روایت ان دونوں کی سند کے ذریعہ بیان ھو ھرگز صحیح نھیں ھوگی۔ جب کہ یہ روایت صحیح و

ثابت روایت کے مخالف ومقابل ھے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ھے کہ حدیث کے ناقل یعنی حاکم نیشا پوری نے اس حدیث کے ضعیف ھونے کا اعتراف کیا ھے لھٰذا اس کی سند کی تصحیح نھیں کی ھے لیکن اس کے مفاد کی صحت پر گواہ لے آئے ھیں کہ وہ بھی سند کے اعتبار سے سست اور اعتبار کے درجہ سے ساقط ھے۔ اس لئے حدیث کی تقویت کے بجائے اس کے ضعف میں اضافہ ھی ھوا ھے۔

وسنتی کی دوسری سند

حاکم نیشاپوری نے ابوھریرہ سے بطور مرفوع (193) نقل کیا ھے:

"انّی قد ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما: کتاب اللہ وسنتی ولن یفترقا حتّٰی یردا علیّ الحوض" (194)

اس متن کو حاکم نے اس سند کے ذریعہ نقل کیا ھے:

1۔ الضبی، از

2۔ صالح بن موسیٰ الطلحی، از

3۔ عبدالعزیز بن رفیع از

4۔ابی صالح،از

5۔ابی ھریرہ.

یہ حدیث پھلی حدیث کی طرح جعلی ھے۔اوراس کی سند کے درمیان صالح بن موسیٰ الطلحی پر انگلی رکھی جاسکتی ھے۔اب ھم اس کے بارے میں علمائے علم رجال کے نظریات نقل کرتے ھیں:

یحییٰ بن معین کا بیان ھے کہ صالح بن موسیٰ قابل اعتماد نھیں ھے۔ابوحاتم رازی کا قول ھے کہ اس کی حدیث ضعیف اور منکر ھے۔وہ بھت سی منکر حدیثوں کو ثقہ افراد کے نام سے نقل کرتا ھے۔نسائی کا بیان ھے کہ اس کی حدیث لکھی نھیں جاتی اور دوسری جگہ کھتے ھیں: اس کی حدیث متروک ھے۔(195)

ابن حجر"تھذیب التھذیب" میں لکھتے ھیں کہ ابن حبان نے کھا ھے: صالح بن موسیٰ، ثقہ افراد سے ایسی چیزیں منصوب کرتا ھے جو ان کی باتیں نھیں لگتیں۔اورآخرمیں ابن حجر نے لکھا ھے کہ: اس کی حدیث حجت نھیں ھے، اورابونعیم کھتے ھیں کہ" اس کی حدیث متروک ھے وہ ھمیشہ منکر حدیث نقل کرتا ھے۔(196)

متروک ھے اور ذھبی، کتاب" کاشف"(198)1# میں لکھتے ھیں: اس کی حدیث سست ایک دوسری جگہ ابن حجر کتاب تقریب (1 9 7) میں لکھتے ھیں: اس کی حدیث ھے۔آخرمیں ذھبی نے" میزان الاعتدال"(199)2# میں مذکورہ بالا حدیث کونقل کرتے ھوئے لکھا ھے کہ اس کی حدیثیں منکر ھوتی ھیں۔

حدیث ”وسنتی“ کی تیسری سند:

ابن عبدالبر نے کتاب ”تمھید“ (200)3# میں اس متن کو حسب ذیل سند کے ساتھ ذکر کیا ھے:

1۔عبدالرحمان بن یحییٰ۔از

2۔احمد بن سعید۔از

3۔محمد بن ابراھیم الدبیلی۔از

4۔علی بن زید الفرائضی۔از

5۔الحنینی۔از

6۔کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف۔از

7۔اس کے باپ نے اس کے دادا سے

ھم ان راویوں کے درمیان کثیر بن عبداللہ پر انگلی رکھتے ھیں۔امام شافعی لکھتے ھیں: وہ جھوٹ کے ارکان میں سے ایک ھے۔(201)4# ابو داود کا بیان ھے: وہ کذابوں اور بڑے جھوٹوں میں سے ھے(202)5# ابن حیان کھتے ھیں: عبداللہ بن کثیر نے اپنے باپ اور دادا سے حدیث کی کتاب نقل کی ھے جس کی بنیاد جعلی حدیثوں پر ھے کہ اس کتاب سے نقل کرنا اور عبداللہ سے روایت کرنا حرام ھے اور فقط تعجیب وتنقید کے لئے اس کی روایت نقل کی جاسکتی ھے۔(203)6#

4۔کاشف، ذھبی، ترجمہ نمبر2412

5۔میزان الاعتدال، ذھبی، ج/2، ص302

3۔التمھید: ج/24، ص331

4۔ 5۔تھذیب التھذیب، ابن حجر، ج/ 1 ص/ 7 7 3، طبع دارالفکر۔تھذیب الکمال: ج/24، ص138

6۔المجروحین از ابن حبان، ج/2، ص221

نسائی اور دارقطنی کھتے ھیں: اس کی حدیث متروک ھے۔ امام احمد بن حنبل کھتے ھیں کہ: وہ منکر الحدیث ھے اور قابل اعتماد نھیں ھے۔ ابن معین نے بھی یھی بات اس کے بارے میں کھی ھے۔

ابن حجر کے اوپر تعجب ھے کہ انھوں نے کتاب "التقریب" میں اس کے حالات بیان کرتے ھوئے اسے صرف ضعیف لکھا ھے اور جن لوگوں نے اسے جھوٹا کھا ھے انھیں افراطی کھا ھے، جبکہ علم رجال کے پیشواؤں نے اسے جھوٹا اور جعل ساز قرار دیا ھے یھاں تک کہ ذھبی کھتے ھیں کہ: اس کی باتیں فضول وضعیف و بیکار ھیں۔

بغیر سند کی روایت

امام مالک نے کتاب "الموطا" میں اس روایت کو سند کے بغیر بطور مرسل نقل کیا ھے۔ اور سب جانتے ھیں کہ ایسی حدیث کوئی اھمیت نھیں رکھتی۔(204)

مذکورہ بالا باتیں پوری طرح سے یہ بات ثابت کرتی ھےں کہ "وسنتی" والی حدیث جھوٹے اور اموی دربار سے وابستہ راویوں کی جعلی اور گڑھی ھوئی حدیث ھے جو انھوں نے حدیث صحیح کے مقابلہ میں گڑھی ھے۔ لھذا مسجدوں کے اماموں، خطیبوں اور اھل منبر حضرات پر واجب ھے کہ جو حدیث حضرت رسول اکرم سے وارد نھیں ھوئی ھے اسے ترک کردیں اور اس کے بجائے لوگوں کو صحیح حدیث سے آگاہ کریں۔ جس حدیث کو مسلم نے "اھل بیتی" کے ساتھ اور ترمذی نے "عترتی واھل بیتی" کے ساتھ نقل کیا ھے اسے بیان کریں۔ طالب علموں پر لازم ھے کہ علم حدیث کی طرف توجہ کریں اور صحیح وضعیف حدیث میں فرق کو سمجھیں۔

آخر میں، میں یہ یاددھانی کرانا چاھتا ھوں کہ لفظ "اھل بیتی" میں پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی ذریت مثلاً حضرت فاطمہ وحسن وحسین علیھم السلام بھی داخل ھیں، کیونکہ مسلم نے اپنی صحیح (205) میں اور ترمذی نے اپنی سنن (206) میں خود ام المومنین عایشہ سے نقل کیا ھے کہ"

"نزلت ھذہ الآیۃعلی النبی (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا"فی بیت ام سلمۃ،فدعاالبنی فاطمۃ وحسناً وحسیناًفجللھم بکساء وعلی خلف ظھرہ فجللہ بکساء ثم قال:اللّٰھم ھٰوٴلاء اھل بیتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیراً،قالت ام سلمۃ وانا معھم یا نبی اللّٰہ؟قال انت علی مکانك وانت الی الخیر"

آیت"انّما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا"

جناب ام سلمہ کے گھر میں نازل ھوئی پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فاطمہ،حسن وحسین علیھم السلام کو کساء کے نیچے لے لیا۔حضرت علی (ع) آپ کی پشت پر کھڑے تھے آنحضرت نے ان پر بھی اپنی عبا اڑھائی اور فرمایا: پالنے والے! یہ میرے اھل بیت ھیں ان سے ھر طرح کی برائیوں کو دور فرما اور انھیں ایسا پاک قرار دے جو پاک کرنے کا حق ھے ۔اس وقت جناب ام سلمہ نے کھا: اے رسول خدا (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا میں بھی ان میں سے ھوں؟ پیغمبر (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔:تم اپنی جگہ پر رھو(یعنی چادر کے نیچے نہ آؤ)تم راہ خیر پر ھو۔(207)

یہ تو تھا اھل سنت کے عالم دین شیخ حسن بن علی سقاف کا برادران اھل سنت کو جواب ۔لیکن یھاں خود شیخ سقاف کے بیان کردہ ایک مسئلہ کو صاف کرنا چاھتا ھوں ۔انھوں نے آیت تطھیر میں ازواج پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے شامل ھونے کو تو مسلم بتایا ھے اور آیت کے مفاد کو وسیع کر کے اس میں پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیٹی اور ان کے دو صاحب زادوں کو شامل کرنے کی کوشش کی ھے ۔جب کہ خود جناب ام سلمہ کی روایت جسے صحیح مسلم اور سنن ترمذی نے نقل کیا ھے ان کے نظریہ کے خلاف گواھی دے رھی ھے ۔اگر اھل بیت کے علاوہ ازواج پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) آیت تطھیر میں داخل ھوتیں تو جناب ام سلمہ کو کساء میں داخل ھونے سے روکا نہ جاتا اور یہ نہ کھا جاتا "انت علی مکانک" یعنی تم اپنی جگہ پر رھو۔اور تم خیر پر ھو!!

اس کے علاوہ جو شخص بھی ازواج پیغمبر (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سلسلہ میں قرآن کی

آیات کا مطالعہ کرے گا اسے واضح طور سے یہ بات معلوم ھو جائے گی کہ ان کے بارے میں آیات کی زبان تنبیہ و شرزنش والی ھے ۔ ایسے افراد آیت تطھیر کے مصداق اور رسول خدا (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا میں شامل نھیں ھو سکتے ۔ اس کی تفصیل "تفسیر منشور جاوید" (208) میں ملاحظہ فرمائیں ۔

2۔ پیغمبر پر صلوات کیسے بھیجیں

شیعہ اور اھل سنت کے درمیان اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ھے کہ وہ جب پیغمبر پر صلوات بھیجتے ھیں تو اس میں ان کی آل کو شامل نھیں کرتے اور وہ "صلی اللہ علیہ وسلم" کھتے ھیں ۔ جب کہ شیعہ پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صلوات بھیجتے وقت ان کی آل (ع) کو بھی شامل کرتے ھیں اور آل کو ان پر عطف کرتے ھوئے کھتے ھیں "صلی اللہ علیہ و آلہ" ۔ اب سوال یہ ھے کہ ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت صحیح ھے ۔

اس میں کوئی شک نھیں کہ ھمارے معصوم رھبروں یعنی ائمہ علیھم السلام نے دوسری صورت کو صحیح جانا ھے اور ھمیشہ آنحضرت کے ساتھ ان کی آل (ع) کو بھی شامل کرتے ھیں ۔ اب ذرا دیکھیں کہ اھل سنت کی روایات میں صلوات کی کیفیت کیا ھے ۔ اور ان کی روایتیں ان دونوں صورتوں میں سے کس کی تصدیق کرتی ھیں ۔

پھلے ھم اس سوال کا مختصر جواب دے چکے ھیں اب یھاں روایت نقل کرتے ھیں :

"جب آیت (ان اللہ و ملائکۃ یصلون علی النبی یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلّموا تسلیماً)

سورۂ احزاب/56" نازل ھوئی تو اصحاب نے آنحضرت سے دریافت کیا کہ آپ پر کس طرح صلوات بھیجیں؟ آنحضرت نے فرمایا: "لاتصلوا علی الصلاۃ البترا ء" مجھ پر ناقص صلوات مت بھیجو۔ لوگوں نے پوچھا کیسے بھیجیں؟ فرمایا: کھو (اللّٰھم صلی علی محمد وآل محمد) (209)

درود بھیجنے کے اعتبار سے آل محمد کی حیثیت ایسی ھے کہ اھل سنت کے بعض فقھی مذاھب آل محمد پر پیغمبر کے ساتھ صلوات بھیجنے کو لازم و واجب جانتے ھیں۔ امام شافعی اس سلسلہ میں فرماتے ھیں:

یااھل بیت رسول اللہ حبکم
فرض من اللہ فی القرآن انزلہ

کفا کم فی عظیم القدر انکم
من لم یصل علیکم لا صلاۃ لہ (210)

اے رسول خدا کے اھل بیت (ع) آپ کی محبت ایسا فریضہ ھے جو قرآن میں نازل کیا گیا ھے آپ کی عظمت وجلالت کے لئے اتنا ھی کافی ھے کہ جو شخص آپ پر صلوات نہ بھیجے اس کی نماز ھی نھیں ھے۔

شعری ترجمہ

اے اھل بیت (ع) آپ کی الفت خدا گواہ ھے
فرض ھر بشر پہ خدا کی کتاب میں

رفعت یہ ھے کہ جو نہ پڑھے آپ پر درود
اس کی نماز ھی نھیں حق کی جناب میں
(از مترجم)

صحیح بخاری اھل سنت کے نزدیک قرآن مجید کے بعد سب سے معتبر اور صحیح کتاب مانی جاتی ھے۔اب ھم سورہ احزاب کی تفسیر کے ذیل میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرتے ھیں:

عبدالرحمان ابن ابی لیلی نقل کرتے ھیں کہ" کعب بن معجرہ نے مجھ سے ملاقات کی اور کھا: کیا تم پسند کرتے ھو کہ میں ایک حدیث تمھیں تحفہ کے طور پر پیش کروں، وہ حدیث یہ ھے کہ ایک روز پیغمبر اکرم اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے۔ھم نے عرض کی: یا رسول خدا! ھم نے آپ پر سلام کرنے کی کیفیت قرآن سے سیکہ لی اب بتائیے کہ آپ پر صلوات کیسے بھیجیں؟ آنحضرت نے فرمایا:

"اللّٰھم صل علی محمد وآل محمد کما صلیت علی ابراھیم وآل ابراھیم انك حمید مجید" (211)

لھذا اسلامی ادب اور پیغمبر اسلام کے حکم کی تعمیل کا تقاضا ھے کہ ھم آنحضرت پر ناقص اور دم بریدہ صلوات نہ بھیجیں نیز آنحضرت اوران کی آل پاک (ع) میں جدائی نہ پیدا کریں۔

تمام شد

بحمداللہ والمنۃ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ الطاھرین خیر الائمۃ

11 / ذیقعدہ 2424ء ہ بروز میلاد حضرت امام رضا۔

حوالے

156۔ سید علی خان مرحوم "مدنی" نے اپنی گرانقدر کتاب "الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعۃ الامامیۃ" میں اصحاب پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں سے ایسے افراد کے نام و خصوصیات بیان کیئے ھیں جو حضرت علی علیہ السلام کے وفادار رھے۔ مرحوم شرف الدین عاملی نے بھی اپنی تالیف العقول المھمۃ ص/ 177 تا ص 192 میں اپنی تحقیق کے ذریعہ ان میں مزید افراد کا اضافہ کیا ھے۔

اس کتاب کے موٴلف نے بھی "شخصیتھا ی اسلامی درشیعہ" کے عنوان سے ایک کتاب تدوین کی ھے جس میں ان افراد کے حالات زندگی اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ان کی ولایت کے مراتب دقیق مآخذ کے ساتھ بیان کئے ھیں اور یہ کتاب چند جلدوں میں شائع ھوگی۔

157۔صحیح بخاری ج/1،ص/22(کتاب علم)

158۔نور/63

159۔حجرات/1

160۔الحجرات/7

161۔مناقب خوارزمی،ص/217

162۔الغدیر،ج/1،ص/153۔171

163۔فرائد المسطین،باب58۔حضرت علی علیہ السلام نے ان تین موقعوں کے علاوہ مسجد کوفہ میں "یوم الرجعہ" نام کے دن،روز"جمل" "حدیث الرکبان" کے واقعہ میں اور"جنگ صفین" میں حدیث غدیر سے اپنی امامت پر استدلال کیا ھے۔

164۔ینابیع المودۃ ص/482

165۔مزید آگاھی کے لئے"الغدیر" ج/1 ص/146 تا ص/195 ملاحظہ فرمائیں۔اس کتاب میں بائیس استدلال حوالوں کے ساتھ درج ھیں۔

166۔ثقل،فتح"ق"اور"ث"اس کے معنی ھیں کوئی بھت نفیس اور قیمتی امر۔اور کسرِ"ث"اور جزم"ق" سے مراد کوئی گرانقدر چیز.

167۔فیض القدیر،ج/3 ص/14

168۔صواعق محرقہ،عسقلانی،حدیث135

169۔ینابیع المودۃ ص/32وص/40

170۔مستدرک،حاکم،ج/3ص/109وغیرہ

171۔بحارالانوارج/22ص/76نقل ازمجالس مفید

172۔الصواعق المحرقہ،ص/75

173۔احتجاج ج/1،ص/210

174۔احتجاج طبرسی،ص/228

175۔جزءدوم ازجلددوازدھم،ص/914کے بعدملاحظہ فرمائیں۔

176 1۔ مستدرک حاکم ،ج/ 3،ص/ 3 4 3۔کنز العمال ،ج/1،ص/250۔صواعق،ص/75۔فیض القدیر،ج/4،ص/356۔

177۔"یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکویٰ بھا جباھھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون"سورہ توبہ/35

178۔اس کے علاوہ گناہ کرنے والے اگر جھوٹ نہ بولیں گےتو اس کالازمہ یہ ھوگا کہ وہ سچائی کے ساتھ اپنے گناھوں کا اعتراف کریں اور جب لوگ ان کی برائیوں سے آگاہ ھوجائیں گےتو فطری طور سے ان کا وقاراوران کی عزت خاک میں مل جائے گی اورلوگ ان سےنفرت کرنےلگیں گے۔نتیجہ میں دوبارہ وھی مشکل پیش آئے گی کہ مربی اپنے عملی گناہ کے سبب لوگوں میں اپنی عزت گنوادے گا۔

179۔لوگوں کا اعتماد جزب کرنے کا لازمہ یہ ھے کہ پیغمبر اپنی زندگی کے تمام ادوار میں چاھے وہ رھبری سے پھلے کی زندگی ھو یا اس کے بعد والی زندگی ھرطرح کے گناہ لغزش اور

الودگی سے پاک و پاکیزہ ھو۔ کیوں کہ یہ بے دھڑک اور سو فی صدی اعتماد اسی وقت ممکن ھے جب اس شخص سے کبھی کوئی گناہ ھوتے ھوئے نہ دیکھا جائے۔ جو لوگ اپنی زندگی کا کچھ حصہ گناہ اور آلودگی میں بسر کرتے ھیں، اسکے بعد توبہ کرتے ھیں، ممکن ھے کہ ایک حد تک لوگوں کا اعتماد جذب کر لیں لیکن سو فی صدی اعتماد تو بھر حال جذب نھیں کر سکتے۔

ساتھ ھی اس بات سے یہ نتیجہ بھی حاصل کیا جا سکتا ھے کہ رھبروں کو عمدی گناہ کے ساتھ ساتھ سھو اور بھول سے کئے گئے گناہ سے بھی محفوظ ھونا چاھئے، کیوں کہ عمدی گناہ اعتماد کو سلب کر لیتا ھے اور سھوی گناہ اگرچہ بعض موارد میں اعتماد سلب کرنے کا باعث نھیں ھوتا لیکن انسان کی شخصیت کو نا قابل تلافی نقصان پھنچاتا اور اس کی شخصیت کو بری طرح مجروح کر دیتا ھے اگرچہ سھوی گناہ کی سزا نھیں ھے اور انسان، دین و عقل کی نگاہ سے معذور سمجھا جاتا ھے لیکن رائے عامہ پر اس کا برا اثر پڑتا ھے اور لوگ ایسے شخص سے دور ھو جاتے یا میں خاص طور سے اگر گناہ بھول سے کسی کو قتل کرنے کا یا اسی جیسا ھو۔

180۔احزاب/32

181۔ یہ وھی صاحبان امر ھیں جو پیغمبر اکرم (صل اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے بعد مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار ھیں۔ یا کم از کم مصداق "اولی الامر" ھیں۔

182۔نساء/59

183۔بقرہ/124

185۔صحیح مسلم، ج/4/3، 18 نمبر 2408 چاپ عبد الباقی

186۔سنن دارمی، ج/2 ص/431-432

187۔سنن ترمذی، ج/5 ص/663 نمبر37788

188۔المستدرک، حاکم، ج/1 ص/93

189۔حافظ مزی، تھذیب الکمال، ج/3 ص/127

190۔ابن حجر عسقلانی مقدمہ فتح الباری، ص/391 طبع دارالمعرفہ

191۔حافظ سید احمد، فتح الملک العلی ص/15

192۔ابوحاتم رازی، الجرح والتعدیل ج/5 ص/92

193۔وہ حدیث جسے راوی معصوم سے نسبت نہ دے

194۔حاکم، مستدرک ج/1، ص93

195۔حافظ مزی، تھذیب الکمال، ج/13، ص96

196۔تھذیب التھذیب، ابن حجر، ج/4، ص355

197۔تقریب، ابن حجر، ترجمہ نمبر2891

204۔الموطا، امام مالک، ص889، حدیث نمبر3

205۔صحیح مسلم، ج/4 ص1883 نمبر2424

206۔ترمذی ج/5 ص663

207۔صحیح صفۃ صلاۃ النبی از حسن بن علی السقاف کے ص/289 تا ص/294 سے ماخوذ

208۔منشور جاوید، ج/5 ص/294

209۔صواعق محرقہ، چاپ دوم مکتبہ" القاھرہ" مصر باب/11 فصل اول ص/146
ایسی ھی روایت سیوطی کی کتاب" الدر المنثور" ج/5 سورہ احزاب کی آیت نمبر 56 کے ذیل میں وارد ھوئی ھے جسے سیوطی نے "المصنف" کے مؤلف عبد الرزاق، ابن ابی شیبہ، احمد بن حنبل، امام نجار و مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن مردویہ سے نقل کیا ھے۔

210۔صواعق محرقہ، باب/11 ص148، اتحاف بشراوی ص29 وغیرہ

211۔صحیح بخاری، کتاب تفسیر جزء6 ص/217 سورۂ احزاب

ISLAMICMOBILITY.COM
IN THE AGE OF INFORMATION
IGNORANCE IS A CHOICE

"Wisdom is the lost property of the Believer,

let him claim it wherever he finds it"

Imam Ali (as)